

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222229

UNIVERSAL
LIBRARY

جلوۂ ایثار

حب وطن کا ایک دلچسپ قصہ

— مصنفہ —

منشی نواب رائے محمد اکبر

— مصنف —

سوز وطن، کشنا وغیرہ

— — — — —

باہتمام بینکٹری سٹریٹریٹر پبلشر

انڈین پریس آلہ آباد مطبع ہوا

— ۱۹۱۲ء —

قیمت ۴۰

(جملہ حقوق محفوظ)

اس میں بہت دن ہوئے جبکہ شیویا اپنے
 جگر کے ٹکڑے روہتاش کو گنگا کی گود میں نہینے
 کے لئے لیگئی تھی۔ رات بڑی بھیانک تھی۔ اور شیویا کی آنکھیں
 ساون کی طرح برس رہی تھیں۔ اُسکا بلاپ سُکر گنگا کی لہریں اُڑاتیں
 اور دیوتاؤں کے جگر پارہ پارہ ہو گئے مگر شیویا کے سیلاب اشک
 میں بھی ہری چند کے پیر نہ ڈگ گئے۔ اُسوقت آکاش سے دیوتاؤں
 نے پھول برسائے۔ اور تینوں لوگ میں جے جے کار کی صدا بلند
 ہوئی۔ وہ دن بھارت کے لئے بہت مبارک تھا۔



یہ ناچیز تصنیف اُسی دھرم بیرہری چند کے نام پر
 معنون کرتا ہوں۔ جو اکمل علی

پہلی فصل

وندھیا پل پہاڑ اُدھی رات کی ڈراؤنی تاریکی میں کالے دیو کی طرح کھڑا تھا۔ اُسپر اُگے ہوئے چھوٹے چھوٹے درخت ایسے نظر آتے تھے گویا اُسکی جٹائیں ہیں۔ اور اُنٹ بجی دیوی کا مندر جسکے گلے پر سیاہ پتاکے ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکوں سے ہل رہے تھے اس دیو کا سر معلوم ہوتا تھا۔ مندر میں ایک ٹٹاٹا ہوا چراغ نظر آتا تھا جسپر کسی دھندلے تارے کا گمان ہوتا تھا۔

اُدھی رات گزر چکی تھی۔ چارو نظروں میں تناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گنگا جی کی سیاہ آنکھیں پہاڑ کے نیچے سکون بخش روانی کے ساتھ بہ رہی تھیں۔ اور اُنکے ہماؤ سے لیکھ والوینے کی صدا اُبل رہی تھی۔ جا بجا کشتیوں پر۔ اور لگاڑوں کے آس پاس ملاحوں کے جھولھوں کی آغ نظر آ جاتی تھی۔ ایسے وقت میں ایک سفید پوش عورت آشتی بجی دیوی کے سامنے ہاتھ باندھے بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسکا متین چہرہ زرد تھا۔ اور اُسٹرے کے ٹبر فٹس میں رہی تھی۔ اُس نے دیر تک سر جھکائے رہنے کے بعد کہا:-

”ماتا آج بیس سال سے کوئی منگل کا دن ایسا نہیں گذرا کہ میں تمہارے چروں سے نہ جھکایا ہو۔ ایک دن بھی ایسا نہیں گذرا کہ میں تمہارے چروں کا دھیان نہ کیا ہو۔“
 ”جگ تارنی مہرائی ہو۔ مگر تمہاری اتنی سیداکر نے پر بھی میرے دل کی آواز دہری دہو؟“
 ”نہیں چھوڑ کر اب کہاں جاؤں۔“

”ماتا! شینے کیڑوں پر تیرے دھماکوں کی آواز سن کر کہہ رہی ہے۔“

نور پھر نہ پورا ہوا۔ تب تمہارے سر نہ آئی۔ اب تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ تمہنے سدا
 نے بھگتوں کی مرادیں پوری کی ہیں۔ کیا میں تمہارے دربار سے نہ اس جاؤں؟
 سبباً اسی طرح دیر تک بنتی کرتی رہی۔ کیا ایک اُسکے دل پر ایک پیچہ کر دینے والی؟
 لی کا غلبہ ہوا۔ اُسکی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور کان میں آواز آئی۔
 ”سبباً! میں تجھ سے بہت خوش ہوئی۔ مانگ کیا مانگتی ہے؟“
 ”سبباً! کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور کلیجہ دھڑکنے لگا۔ آج میں سال کے
 رانی نے درشن دئے۔ کانپتے ہوئے بولی۔ ”جو کچھ مانگوں گی وہ مہارانی دیں گی۔“
 ”ہاں ملیگا!“

”میں بڑی تپسیا کی ہے۔ اس لئے بڑا بھاری بردان مانگوں گی۔“
 ”کیا لیگی؟ کبیر کا دھن؟“

”نہیں!“

”اندرا کا بل؟“

”نہیں!“

”سوتلی کی؟“

”نہیں!“

”پھر کیا لیگی؟“

”ہنسار کا سب سے اتم پدارتھ؟“

”کیا ہے؟“

”جو گل کا نام روشن کرے“

نہیں

”جو ماں باپ کی سیوا کرے“

نہیں

”جو دُعا مان اور بلوان ہو“

نہیں

”جو سچوت بیٹا کے کہتی ہے“

”جو اپنے دلیں کا اُپکار کرے“

”تیری بدھی کو دھنیہ ہے۔ جاتیری اچھا پوری ہوگی

دوسری فصل

ویراگ

منشی سالکرام بنارس کے پڑنے رئیس تھے۔ پیشہ وکالت تھا۔ اور مروتی جائیداد پر
 دس سیمہ گھاٹ پر اٹکا عالی شان مکان آسمان سے باقی کرتا تھا۔ فیاض ایسے کہ
 پچیس ہزار سالانہ کی آمدنی خرچ کو کافی نہ ہوتی۔ سادھوؤں اور برہمنوں کے بچے معتقد جو
 کچھ لٹاتے برہم بھوج اور سادھوؤں کی تواضع و تکریم میں صرف ہو جاتا۔ شہر میں کوئی سادھو
 کوئی مہاتما آجائے وہ منشی جی کا مہمان تھا۔ سنسکرت کے ایسے عالم کہ بڑے بڑے پنڈت
 نچالو ہا مانے۔ ویدانت کے اصولوں کے پابند تھے۔ اور طبیعت کا میلان ویراگ کی طرف تھا
 منشی جی کو غلطہ بچوں سے بہت انس تھا۔ سداے محلے کے بچے انکی شفقت اور
 پیار سے فیضیاب ہوتے رہتے تھے۔ جب وہ گھر سے نکلتے تو بچوں کا ایک لشکر ساتھ
 ایک بار کوئی سدا دل ماں اپنے بچے کو مار رہی تھی۔ لڑکا ہلک ہلک کر روتا تھا۔ منشی جی سے نصیحت
 نہ سکا۔ دڑے۔ بچے کو گود میں اٹھالیا۔ اور عورت کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ اُسدن سے
 اتنے اپنے بچے کو مارے گی قسم کھالی۔ جو شخص غیروں کے لڑکوں کا ایسا دلدادہ ہو۔
 اپنے بچے کو اپنا پیار کرے گا اسکا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ جب سے بیٹا پیدا ہوا منشی جی
 کھل کھل کا موم سے کنارہ کش ہو گئے۔ کہیں لڑکے کو ہنڈوے میں تھپھار ہے ہیں اور
 ہو رہے ہیں۔ کہیں اُسے ایک خوشنما سیر گاڑی میں بٹھا کر خود گھینچ رہے ہیں۔ ایک لمحہ
 اُسے اپنے پاس سے جدا نہ کرتے۔ لڑکے کی محبت میں اپنے تئیں بھول گئے۔

یہی مرکز گفتگو تھا۔ جو سنتا افسوس کرتا۔ کیا امیر کیا غریب یہ ماتم عام تھا۔ انکی ذات سے چارو نظرت زندہ دلی بھیلی ہمتی تھی۔ اب ایک ماتم چھایا ہوا تھا۔ جن گلیوں سے وہ بچوں کی فوج لیکر نکلتے تھے وہاں اب خاک اڑ رہی تھی۔ بچہ بار بار اُنکے پاس آنے کے لئے روتے اور منہ کرتے۔ اُن بچپروں کو کیا خبر تھی کہ اب وہ منغل ویران ہو گئی۔ اُنکی مائیں اپنچل سے منہ ڈھانپ ڈھانپ کر روتیں جیسے اُنکا کوئی عزیز مر گیا ہو۔

یوں تو منشی جی کے غائب ہونیکار و ناسمجی رو رہے تھے۔ مگر سب سے گاڑھے اُسنو اُن اڑھتیوں اور سوداگردوں کی آنکھوں سے نکلتے تھے۔ جیسا کہ ابھی حساب کتاب نہیں ہوا تھا۔ دس بارہ دن تو اُنھوں نے جوں توں کر کے گزارا کیا مگر آخر کب تک۔ ایک ایک کر کے حساب کی فردیں پیش ہونے لگیں۔ کسی برآمدہ بھیجیں۔ دوسرے وہیر کا گھی آیا ہے اور قیمت نہیں دی گئی۔ کہیں سے دو سو من میہ آیا ہوا ہے۔ بزاز کا ہزاروں کا حساب ہے۔ مندر بناتے وقت ایک مہاجن سے بیس ہزار قرض لیا گیا تھا۔ وہ ابھی جوں کا توں چڑھا ہوا۔ مطالبات کا تو یہ حال تھا۔ اثنا کا یہ حال کہ بزاز ایک عالی شان عمارت اور اسکے لوازمات کے کوئی ایسی جائداد نہ تھی جس سے کوئی رقم کثیر کھڑی ہو سکے۔ اسکے سوا اب کوئی تدبیر نہ تھی کہ علاقہ نیلام پر چڑھا دیا جائے۔ اور اسکے محاصل سے یہ مطالبات ادا کئے جائیں۔

بیچاری سبباً ماسر بھجکائے بورے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ پر تاپ چند اپنے لکڑی کے گھوڑے پر سوار آنگن میں طعنے مار رہا تھا کہ پنڈت مراد نام شاستری جو مٹا جان کے پر دہت تھے مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ اُنھیں قہقہہ دیکھ کر مایوس سبباً ماسر بھجکائے بورے پر بیٹھی کہ شاید یہ کوئی خوش خبری لائے ہیں۔ اُنکے من بچا دیا۔ اور امید و انگیزوں سے دیکھنے لگی۔ پنڈت جی اسن پر بیٹھے اور سنگھنی سوئے۔ بے بسے تم نے مہاجن کا

سبب کیا؟

سبا با۔ وہ سادہ لباس پہن رہی تھیں دیکھنا تو۔

سہوئے رام۔ سہم بڑی گہری ہے۔ منی ہی نے آگاہ بیچا کچھ نہ سوا۔ اپنے یہاں کوئی صاحب کلب نہ رکھا۔

سبا با۔ ہاں انجیر یہ رقم گہری ہی ہے۔ نہیں تو اتنا اتنا روپیہ ایک ایک بھج میں اٹھایا ہے۔ سہوئے رام۔ سب دن برابر نہیں جاتے۔

سبب با۔ اب تو جوایشہ کرے گا وہ ہوگا۔ میں کیا کر سکتی ہوں؟

سہوئے رام۔ ہاں ایفٹو کی اچھا تو مول ہی ہے مڑا تھے بھی کچھ سوچا ہے؟

سبب با۔ ہاں۔ علاقہ بنلام کر دوں گی۔

سہوئے رام۔ رام رام۔ یہ کیا کہتی ہو۔ ملا کہ بک گیا تو پھر بات کیا رہ جائیگی؟

سبب با۔ اس کے سوا کچھ تدبیر نہیں ہے۔

سہوئے رام۔ بھلا ملاں اس سے ٹھکایا تو تلگوں کا نمبر بسر کیسے ہوگا؟

سبب با۔ ہمارا ایفٹو اس کے لیے۔ وہی پیڑا پار لگا دے گا۔

سہوئے رام۔ یہ تو بڑی بات ہے اس کی بات ہوگی کہ ایسے پھل دی کوئی کے لو کہ بلے کو کھاٹھا ہے؟

سبب با۔ ایفٹو کو یہی ہے کہ کسی کا کیا بس؟

سہوئے رام۔ بھلا میں اس کے بتاؤں کہ سانپ بھی مرہاے اور لالچی بھی نہ ٹوٹے؟

سبب با۔ تین بتائیے کہ کیا پکار ہوگا؟

سہوئے رام۔ پہلے تو ایک دکان لکھو کہ کلٹر صاحب کو دید کہ مانگہا ہی مانگہا کی رہا ہے۔

سبب با۔ ہاں۔ اور پھر وہ دکان پر جاؤں گے کہ کریں گے کہ کراؤں گے؟

آج دس بجے ہیں۔

سُہبانا: کچھ معلوم تھا کہ یہ کس سے لائیں گے؟
 موئے رام: تمہارے لئے روپیے کا کیا اکیان۔ منی سی کے نام پر بلا لکھا ہے منی کے
 اتھار روپیہ کا بندوبست ہو جاتا کوئی بڑی بات نہیں سچ تو یہ ہے کہ روپیہ کتنا ہوا ہے
 تمہارے منہ سے ہاں نکلنے کی دیر ہے۔

سُہبانا: شہر کے رئیسوں نے جمع کیا ہو گا۔

موئے رام: ہاں بات کی بات میں روپیہ جمع ہو گیا۔ صاحب کا سامان بہت تھا۔

سُہبانا: کچھ سوچ کر معافی کی درخواست مجھ سے دلکھرائی جائیگی۔ امداد پہنچنے کے

نام پر قرض لینا چاہتی ہوں۔ میں سب کا ایک ایک پیسہ ملاؤں گا۔

یہ کہہ کر سُہبانے نکھائی کے ساتھ منہ پھیر لیا اور اُسکے نزدیک آ کر

پر ہلکا سا غصہ دکھائی دیا۔ موئے رام نے دیکھا بات بگڑ چکی ہے تو سنبھلا کر

جیسی تمہاری مرضی۔ اس میں کوئی جبر جبری نہیں ہے۔ نہ اپنے ٹکڑے کی طرح کاٹ کر

دیکھا تو اس دن پرے ہو جائیگا پس اتنا سمجھ لو۔

سُہبانا: تو آپ کیا چاہتے ہیں کہ میں اپنے پیسے کے نام پر دوسروں کے سامان کا

میں اسی گھر میں جل مروں گی۔ فاسے کر کے کر کے مر جاؤ گی اگر کسی کا سامان

موئے رام: جی جی تمہارے اور اوسان کون کر سکتا ہے کسی بات منہ سے نہ جاتی ہو۔

کتنے لینے میں کوئی سرم نہیں ہے۔ کون رئیس ہے جو ہر ایک کو لاکھ لاکھ

سُہبانا: مجھے نہیں پتا کہ اس قرض میں سامان شامل نہیں ہے۔

موئے رام: سُہبانا! اس سے مراد کہاں گئی ہے۔ بھلا تو سب کے لئے

حساب دیکھا؟

سُباما۔ دیا یو ساندھ لہجہ میں، ”ہاں دیکھا تو“

موٹے رام۔ سکڑی گہری ہے۔ منی جی نے آگاہ بیچا کچھ نہ سوچا۔ اپنے یہاں کوئی حساب کتاب نہ رکھا۔

سُباما۔ ہاں اتو یہ رقم گہری ہی ہے۔ نہیں تو اتنا اتنا روپیہ ایک ایک بھوج میں اٹھ گیا ہے۔
موٹے رام۔ سب دن برابر نہیں جاتے۔

سُباما۔ اب تو جوا ایشور کرے گا وہ ہوگا۔ میں کیا کر سکتی ہوں؟

موٹے رام۔ ہاں ایشور کی اچھا تو مول ہی ہے مڈا تھنے بھی کچھ سوچا ہے۔
سُباما۔ ہاں۔ علاقہ نیلام کر دوں گی۔

موٹے رام۔ رام رام۔ یہ کیا کہتی ہو۔ علاقہ بک گیا تو پھر بات کیا رہ جائیگی۔
سُباما۔ اس کے سوا اب کوئی تدبیر نہیں ہے۔

موٹے رام۔ بھلائے۔ اس سے نکلیا تو تلگوں کا گجڑ بھر کیسے ہوگا۔
سُباما۔ ہمارا ایشور کہہ رہا ہے۔ وہی بیڑا پار لگا دے گا۔

موٹے رام۔ یہ تو بڑا ہے۔ دوس کی بات ہوگی کہ ایسے پکاری لومی کے لڑکے بلے دکھ اٹھائیں۔
سُباما۔ ایشور کو یہی ہے۔ کسی کا کیا بس؟

موٹے رام۔ بھلائے۔ بتاؤں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔
سُباما۔ ہاں بتائیے۔ کچھ بھلائے۔ اچھا ہوگا۔

موٹے رام۔ پہلے تو ایک دیکھو۔ لکھو اگر کلٹر صاحب کو دیدو کہ مالگجاری ماپھ کی جائے۔
باکی روپیہ کا بندوبست ہو جائے اور چھوڑ دو ہم جو چاہیں گے کریں گے۔ مگر لا کے پر

آنچ نہ آنے پائیگی۔

سُباما۔ ”کچھ معلوم تو ہوا آپ اتنا روپیہ کہاں سے لائیں گے؟“
 موٹے رام۔ ”تمہارے لئے روپیے کا کیا کلتیان۔ منی جی کے نام پر بلا لکھا پڑھی کے پچاس
 ہتھار روپیہ کا بند وایت ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ روپیہ رکھا ہوا ہے۔
 تمہارے منہ سے ہاں نکلنے کی دیر ہے۔“

سُباما۔ ”شہر کے رئیسوں نے جمع کیا ہوگا۔“
 موٹے رام۔ ”ہاں بات کی بات میں روپیہ جمع ہو گیا۔ صاحب کا اسارہ بہت تھا۔“
 سُباما۔ ”کچھ سوچ کر معافی کی درخواست مجھ سے دلکھوائی جائیگی۔ اور نہ اپنے پتی کے
 نام پر قرض لینا چاہتی ہوں۔ میں سب کا ایک ایک پیسہ علاقہ سے ادا کر دوں گی۔“
 یہ کہہ کر سُباما نے رکھائی کے ساتھ منہ پھیر لیا۔ اور اس کے زرد اور افسوسناک چہرہ
 پر ہلکا سا غصہ دکھائی دیا۔ موٹے رام نے دیکھا بات بگڑ چاہتی ہے تو سنبھل کر بولے ”اچھا
 جیسی تمہاری مرضی۔ اس میں کوئی جبر جبری نہیں ہے۔ مدانتے تک کسی طرح کا دکھ اٹھاتے
 دیکھا تو اس دن پرے ہو جائیگا بس اتنا سمجھ لو۔“

سُباما۔ ”تو آپ کیا چاہتے ہیں کہ میں اپنے پتی کے نام پر دوسروں کے احسان کا بوجھ رکھ لوں۔
 میں اسی گھر میں جل مروں گی۔ قاتلے کرتے کرتے مر جاؤں گی مگر کسی کا احسان نہ اٹھاؤں گی۔“
 موٹے رام۔ ”چھی چھی تمہارے اوپر اوسان کون کر سکتا ہے۔ کیسی بات منہ سے نکالتی ہو۔
 کرج لینے میں کوئی سرم نہیں ہے۔ کون رئیس ہے جس پر لاکھ دو لاکھ کا کرج نہ ہو۔“

سُباما۔ ”مجھے یقین نہیں آتا کہ اس قرض میں احسان شامل نہیں ہے۔“
 موٹے رام۔ ”سُباما! تمہاری بدھ کہاں گئی ہے۔ بھلا تم سب طرح کے دکھ اٹھاؤ۔“

مگر کیا تمہیں اس بالک پر ترس نہیں آتا۔“

موٹے رام کی یہ چوٹ کاری پڑی۔ سُباما آبدیدہ ہو گئی۔ اور بیٹے کی طرف ہر مسرت نگاہوں سے دیکھا۔ اس بچے کے لئے کون کون سی تپسیا نہیں کی۔ کیا اب اُسکی تقدیر میں دُکھ اٹھانا لکھا ہے۔ جو لودھال ہوا کے تیز جھونکوں سے بچایا جاتا تھا۔ جسپر آفتاب کی تیز کرنیں نہ پڑ پاتی تھیں۔ جو تروتازگی کے حنڈولے میں جھول رہا تھا۔ کیا وہ آج اس جلتی ہوئی دھوپ اور اس آگ کی لپٹ میں مرجھائے گا۔ سُباما کی منٹ تک اسی فکر میں بیٹھی رہی۔ موٹے رام دل میں خوش ہو رہے تھے کہ اب بازی مار لی۔ اتنے میں سُبامانے مڑاٹھایا اور بولی۔ جبکہ باپ نے لاکھوں کو جلایا کھلایا وہ دوسروں کا آسرت نہیں بن سکتا۔ اگر آپ کا دھرم اُسکی مدد کرے گا تو وہ خود دس کو کھلا کر کھائے گا۔ (اڑکے کو بلاتے ہوئے) بیٹا۔ ذرا یہاں آؤ۔ کل سے تمہاری مٹھائی بند۔ دودھ گھی سب بند ہو جائے گا۔ رو گئے تو نہیں۔ یہ کہہ کر اُس نے بیٹے کو پیار سے گود میں بٹھایا۔ اور اُس کے گلابی رخساروں سے پسینہ پوچھ کر ایک بوسہ لے لیا۔

پر تپ۔ ”کیا کہا کل سے مٹھائی بند ہو گئی۔ کیوں؟ کیا علوانی کی دوکان میں مٹھائی نہیں ہے۔“

سُباما۔ ”مٹھائی تو ہے مگر اُسکا روپیہ کون دے گا۔“

پر تپ۔ ہم بڑے ہو گئے تو اُسکو بہت سارے پیسے دیں گے۔ چل ٹخ ٹخ! دیکھو اماں کیسا تیز گھوڑا ہے۔“ سُباما کے آنکھوں میں پھر آنسو اُڑا اُڑے۔ افسوس! کیا اس حُسن و زینت کے پتے پر ابھی سے افلاس کی مصیبت آجائیگی۔ نہیں نہیں! میں خود سب بھگت لوں گی۔

مگر اپنے پیارے بچے پر مصیبت کی پرچھائیں نہ آنے دوں گی۔ ماں تو یہ خیال کر رہی تھی باکی رو پر تپ اپنے مُنہ زور بد لگام اس چوہن کو زیر کرنے میں ہمہ تن مصروف تھا۔ بچے بچے

ہوتے ہیں۔ دل کے بادشاہ!

الغرض موٹے رام نے بہت کچھ جال پھیلایا بہت فصاحت و بلاغت صرف کی۔ مگر سبباً مانے ایک دفعہ نہیں کر کے ہاں نہ کی۔ اُسکی اس وضع داری کا تذکرہ جس نے سنا واہ واد کی۔ لوگوں کے دل میں اُسکی عزت دو چند ہو گئی۔ اُس نے وہی کیا جو ایسے سیر چشم اور دریا دل آدمی کی بیوی کے شایاں شان تھا۔

اسکے چند رصویں دن علاقہ نیلام پر چڑھا۔ بچاس ہزار کی رقم وصول ہوئی۔ کل مطالبے چکا دئے گئے۔ گھر کے بے ضرورت سامان فروخت کر دئے گئے۔ مکان میں بھی سبباً مانے اندر سے اونچی اونچی دیواریں کھینوا کے دو علیحدہ علیحدہ درجے کر دئے۔ ایک میں خود رہنے لگی۔ اور دوسرا کرایہ پر اٹھا دیا۔



تیسری فصل

نئے پڑوسیوں سے میل جول

— ❦ —

منشی سچون لال جنھوں نے سباما کا مکان کرایہ پر لیا تھا اعلیٰ درجہ کے خوش خیال آدمی تھے۔ پہلے ایک سرکاری عہدہ پر ممتاز تھے۔ مگر اپنی آزاد طبیعت کے باعث افسروں کو خوش نہ رکھ سکے۔ یہاں تک کہ انکی ناراضی سے تنگ آکر استعفیٰ دیدیا۔ دوران ملازمت میں تھوڑا سا سرمایہ فراہم کر لیا تھا۔ نوکری چھوڑتے ہی ٹھیکہ داری کی طرف رجوع ہو گئے۔ اور اپنی محنت اور جانفشانی سے تھوڑے ہی عرصہ میں اچھی خاصی ثنیت بنالی۔ اسوقت انکی آمدنی چار پانچ سو کی اوسط سے کم نہ تھی۔ کچھ ایسی معاملہ فہم طبیعت پائی تھی کہ جس تعمیر میں ہاتھ لگاتے نفع کے سوا نقصان نہوتا۔

منشی سچون لال کا لمبہ بہت بڑا نہ تھا۔ اولاد میں تو ایشور نے کئی دیں۔ مگر وہ سب بچپن ہی میں دانغ مفارقت دگئی تھیں۔ اب اسوقت ماں باپ کے آنکھوں کی پتلی مرنے کی لڑکی تھی۔ اُسکا نام برج رانی تھا۔ وہی والدین کی زندگی کا سہارا تھی۔

پر تپا چند اور برج رانی میں پہلے ہی دن سے دوستی شروع ہو گئی۔ آدھ گھنٹہ میں دونوں چڑیلوں کی طرح چپکنے لگے۔ برج رانی نے اپنی گڑیاں کھلونے۔ بابے دکھائے۔ پرتاپ نے اپنی کتابیں۔ قلم اور تصویریں پیش کیں۔ برج رانی کی ماں (سوسیلا) نے پرتاپ کو گود میں لے لیا۔ اور خوب پیار کیا۔ اُس دن سے وہ روز شام کو آتا۔ دونوں بھولی سا تھکے ساتھ کھیلتے

ایسا معلوم ہوتا کہ دونوں بھائی بہن ہیں۔ سوسیلہ دونوں لڑکوں کو گود میں بٹھاتی۔ اور بیمار کرتی۔ گھنٹوں ٹٹکی لگائے دونوں بچوں کو دیکھا کرتی۔ برجن بھی کبھی کبھی پرتاپ کے گھر جاتی۔ مصیبت کی ماری سب اُسے دیکھ کر اپنی مصیبت بھول جاتی۔ چھاتی سے لگا لیتی۔ اور اُسکی بھولی بھولی باتیں سن کر اپنا غم غلط کرتی۔

ایک روز منشی سمیون لال باہر سے آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پرتاپ اور برجن دونوں دفتر میں کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ پرتاپ کوئی کتاب پڑھ رہا ہے۔ اور برجن دھیان لگائے سُن رہی ہے۔ دونوں نے جوں ہی منشی جی کو دیکھا اُٹھ کھڑے ہوئے۔ برجن تو دوڑ کر باپ کے گود میں جا بیٹھی۔ اور پرتاپ سر نہیچا کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ کیسا ذی شعور لڑکا تھا۔ سن ابھی آٹھ سال سے زیادہ نہ تھا۔ مگر بُرے سے اُسے والی غفلت جھلک رہی تھی۔ روشن اور مردانہ چہرہ۔ پاک و صاف ہاتھ پاؤں۔ پتلے پتلے سُرُج مونٹ۔ تیز چلتی ہوئی آنکھیں۔ کالے کالے بھونرے کی طرح بال۔ اُسپر کپڑے صاف سُتھرے۔ منشی جی نے کہا ”ہاں کو پرتاپ“ پرتاپ آہستہ آہستہ کچھ ہچکچاتا۔ کچھ بجاتا قریب آیا۔ منشی جی نے پدرانہ محبت سے گود میں بٹھالیا اور پوچھا ”تم ابھی کونسی کتاب پڑھ رہے تھے؟“

پرتاپ بولنے ہی کو تھا کہ برجن بول اُٹھی۔ ”بابا بڑی اچھی اچھی کہانیاں تھیں۔“

کیوں بابا کیا پہلے پڑیاں بھی ہماری طرح باتیں کرتی تھیں۔“

منشی جی مسکرا کر بولے ”ہاں۔ وہ خوب بولتی تھیں۔“

ابھی اُنکے مُنہ سے پوری بات بھی نہ نکلنے پائی تھی کہ پرتاپ۔ جسکا شرمیلہ لہجہ اب

دور ہو چلا تھا بول اُٹھا ”نہیں برجن۔ تھیں جھٹلاتے ہیں۔ یہ کہانیاں بنائی ہوئی ہیں۔“

منشی جی اس بیباکانہ تردید پر خوب ہنسے۔

ابو پرتاپ بلبل کی طرح پھٹکنے لگا۔ اسکول اتنا بڑا ہے کہ شہر بھر کے لوگ اُس میں بیٹھ جائیں۔ دیواریں اتنی اونچی ہیں جیسے تار۔ بلدیو پرشاد نے جو گیند میں ہٹ لگائی تو وہ آسمان میں چلا گیا۔ بڑے ماسٹر صاحب کی میز پر ہری ہری بانا تہ بھی ہوئی ہے۔ اُس پر پھولوں کے بھرے گلاس رکھے رہتے ہیں۔ گنگا جی کا پانی نیلا ہے۔ ایسی زور سے ہوتا ہے کہ پہاڑ بھی ہو تو بہہ جائے۔ وہاں ایک سادھو بابا ہیں۔ ریل دوڑتی ہے سن سن۔ اُس کا انجن لوٹا ہے بھک بھک۔ انجن میں بھاپ ہوتی ہے۔ اُسی کے زور سے گاڑی چلتی ہے۔ گاڑی کے ساتھ ساتھ درخت بھی دوڑتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح کی کتنی باتیں پرتاپ نے اپنی بھولی زبان میں بیان کیں۔ برجن تصویر کی طرح خاموش بیٹھی ہوئی سن رہی تھی۔ ریل پر وہ بھی دو تین بار سوار ہوئی تھی۔ مگر اُسے آج تک یہ نہ معلوم ہوا کہ اُسے کس نے بنایا۔ اور وہ کیونکر چلتی ہے۔ دو تین بار اُسے اپنے گرو جی سے یہ سوال کیا تھا۔ مگر انھوں نے یہی کہکر ٹال دیا کہ بچا ایشور کی مہا پریم پاسبے۔ برجن نے بھی سمجھ رکھا تھا کہ ایشور کی مہاکوئی بڑا بھاری اور طاقتور گھوڑا ہوگا۔ جو اتنی گاڑیوں کو سن سن کھینچنے لئے جاتا ہوگا۔ جب پرتاپ خاموش ہوا تو برجن نے باپ کے گلے میں ہاتھ ڈالکر کہا ”بابا ہم بھی پرتاپ کی کتاب پڑیں گے“

منشی۔ بیٹی تم تو سنسکرت پڑھتی ہو۔ یہ تو بھاشا ہے۔
 برجن۔ تو میں بھی بھاشا ہی پڑھو گی۔ اس میں کیسی اچھی اچھی کہانیاں ہیں۔ میری کتاب میں تو ایک کہانی بھی نہیں۔ کیوں بابا پڑھنا کہتے ہیں؟

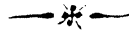
منشی جی بغلیں جھانکنے لگے۔ انھوں نے آج تک خود کبھی غور نہیں کیا تھا کہ پڑھنا کیا چیز ہے۔ ابھی وہ سر ہی کھلا رہے تھے کہ پرتاپ بول اُٹھا۔ مجھے تم سے پڑھتے دیکھا

اُسی کو پڑھنا کہتے ہیں۔“

برجن۔ کیا میں نہیں پڑھتی۔ میرے پڑھنے کو پڑھنا نہیں کہتے؟
برجن سدھانت کو مدی پڑھ سہی تھی۔ پرتاپ نے کہا ”تم ٹوٹے کی طرح رتی ہو“

چوتھی فصل

رشتہ اتحاد مضبوط ہوتا ہے



کچھ عرصہ سے سُبا مانے گنجائش نہ دیکھ کر مہراجن۔ کمار اور دو مہرلوں کو جواب دیا تھا۔
کیونکہ اب نہ تو انکی کوئی ضرورت تھی۔ اور نہ انکا خراج سنبھالے سنبھلتا تھا صرف ایک بڑھیا مہری
باقی رہ گئی تھی۔ اور پکا کام کاج وہ کرتی۔ سارکھا نا سُبا مانو اپنے ہاتھ سے پچا لیتی۔ مگر بیچاری ایسی
سخت محنت کی عادی تو تھی نہیں۔ چنڈ ہی دونوں میں اُسے ٹھکن کے سبب سے رات کو جھرت
رہنے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ جب دیکھے حرارت موجود جسم ٹھنکا جاتا ہے۔ نہ کھانے کی طرف
غبت ہے نہ پیئنے کی طرف۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ مگر وہ ہے کہ روز معمول کے موافق کام کئے باقی
ہے۔ دوا دار دکی بھی کوئی فکر نہیں۔ اور نہ کسی سے اسکا ذکر کرتی ہے۔ جب تک پرتاپ گھر پر بیٹا ہے
تب تک وہ چہرے کو ذرا بھی مہم نہیں ہونے دیتی۔ مگر جوں ہی وہ مدرسہ چلا جاتا ہے۔ لحات
اوڑھ کر پڑھتی ہے۔ اور دن بھر پڑے پڑے کراہا کرتی ہے۔

پرتاپ سمجھدار لڑکا تھا۔ ماں کی حالت روز بروز خراب ہوتے دیکھ کر مانگ گیا کہ یہ بیمار ہے

ایک دن اسکول سے لوٹا تو سیدھا اپنے گھر گیا۔ بیٹے کو دیکھتے ہی سُبّا نے اُٹھ بیٹھنے کی بخش کی۔ مگر مارے ضنعت کے چکر آگیا۔ اور ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ پرتاپ نے اُسے سنبھالا۔ اور اُس کی طرف ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولا: ”اماں تم آج کل بیمار ہو گیا۔ اتنی دُہلی کیوں ہو گئی ہو۔ دیکھو تمہارا جسم کتنا گرم ہے۔ ہاتھ نہیں رکھا جاتا۔“

سُبّا نے ہنسنے کی کوشش کی۔ اپنی بیماری کا اظہار کر کے بیٹے کو کیسے تکلیف دے مانتا پاک اور بغیر حق محبت کا انتہائی درجہ ہے۔ آواز کو ہلکا بنا کر بولی: ”نہیں بیٹا۔ بیمار تو نہیں ہوں۔ آج ذرا حرارت ہو آتی تھی۔ شام تک بالکل اچھی ہو جاؤں گی۔ الماری میں حلو رکھا ہوا ہے نکالو۔ نہیں تم آؤ بیٹھو۔ میں ہی نکالے دیتی ہوں۔“

پرتاپ: ”اماں تم مجھ سے بہانہ کرتی ہو۔ تم ضرور بیمار ہو۔ ایک دن میں کوئی اتنا دُہلا نہیں ہو جاتا۔ سُبّا: (دھنک) ”کیا تمہارے دیکھنے میں میں دُہلی ہو گئی ہوں۔ مجھے تو نہیں معلوم ہوتا۔“

پرتاپ: ”میں ڈاکٹر صاحب کے یہاں جاتا ہوں۔“

سُبّا: ”پرتاپ کا ہاتھ پکڑ کر تم کیا جانو وہ کہاں رہتے ہیں۔“

پرتاپ: ”پلو جھتے پلو جھتے چلا جاؤ نکلا۔“

سُبّا کچھ اور کہا جا رہی تھی کہ اُسے پھر چکر آیا۔ آنکھیں پتھر اُگئیں۔ پرتاپ اُسکی یہ حالت دیکھتے ہی سہم گیا۔ اور کچھ تو نہ ہو سکا۔ دوڑا ہوا برجن کے دروازہ پر آیا۔ اور کھڑا ہو کر رونے لگا۔ ہر روز وہ اس وقت تک برجن کے گھر پہنچ جاتا تھا۔ آج جو دیر ہوئی تو وہ گھبرائی ہوئی ادھر ادھر بھر رہی تھی بیکایک جو دروازہ پر جھانکنے آئی تو پرتاپ کو دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے دیکھا۔ پہلے تو سمجھی کہ اسنے دُہلی سے منہ چھپا لیا ہے۔ مگر جب اُسکے ہاتھ ہٹائے تو اُنکو نظر آئے۔ چونک کر بولی ”لو کیوں روتے ہو بتا دو۔“

پر تاپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ بلکہ اور سسکنے لگا۔

برجن: ”نہ بتاؤ گے۔ کیا چچی نے کچھ کہا ہے۔ جاؤ تم چپ نہیں ہوتے۔“

پر تاپ نے کہا ”نہیں برجن۔ اماں بہت بیمار ہیں۔“

یہ سنتے ہی برج رانی دوڑی۔ اور دم زدن میں سُباما کے سر حانے اکھڑی ہو گئی۔ دیکھا

تو وہ بے حس و حرکت پڑی ہے۔ آنکھیں بند ہیں۔ اور سانس زور زور سے چل رہی ہے۔ ہاتھ پکڑ کر جھنجھوٹنے لگی۔ چچی کیا جی ہے۔ آنکھیں کھولو کیا جی ہے۔“

گورچھی نے آنکھیں نہ کھولیں تب اُس نے طاق پر سے تیل اُتار لیا۔ اور سُباما کے سر میں

ڈالکر آہستہ آہستہ ملنے لگی۔ اُس غریب کے سر میں مہینوں سے تیل پڑنے کی نوبت نہ آئی تھی۔

ٹھنڈا مل پہونچیں تو آنکھیں کھل گئیں۔

برجن: ”چچی کیا جی ہے؟ کیسے درد تو نہیں؟“

سُباما: ”نہیں بیٹی درد کیسے نہیں ہے۔ اب میں بالکل اچھی ہوں۔ بھیا کہاں ہے؟“

برجن: ”وہ تو میرے گھر ہیں۔ بہت رو رہے تھے۔“

سُباما: ”تم جاؤ اُسکے ساتھ کھیلو۔ اب میں بالکل اچھی ہوں۔“

برجن: ”میں ابھی نہ جاؤنگی۔ جب تم اچھی ہو جاؤنگی تب جاؤنگی۔“

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ سوسیلہ بھی داخل ہوئی۔ اُسے سُباما سے ملنے کا تو

بہت دنوں سے اشتیاق تھا۔ مگر کوئی موقع نہ ملتا تھا۔ اس وقت عیادت کے بہانے سے

آپہونچی۔ برجن نے اپنی ماں کو دیکھا تو اُچھل پڑی۔ اور تالی بجا بجا کر کہنے لگی۔ اماں آئیں۔

اماں آئیں۔“

دونوں عورتوں میں شکوہ شکایت ہونے لگے۔ باتوں باتوں میں چراغ جل گیا۔

کسی کو خیال بھی نہ گذرے کہ پرتاپ کہاں ہے۔ ذرا دیر تک تو وہ دروازے پر کھڑا رہا۔ پھر یکایک آنکھیں پونچھ کر ڈاکٹر کچلو کے مکان کی طرف لپکتا ہوا چلا۔ ڈاکٹر صاحب منشی سالگرام کے دوستوں میں تھے۔ اور جب کبھی ضرورت ہوتی وہی بلائے جاتے۔ پرتاپ کو صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ برتاندی کے کنارے لال بنگلے میں رہتے ہیں۔ اُسے اب تک اپنے محلہ سے باہر نکلنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ مگر اس وقت فرزندِ نازِ جوش کی بیقراری میں اُسے ان رکاوٹوں کا مطلق دھیان نہ آیا گھر سے نکل کر بازار میں آیا۔ اور ایک یکہ دالے سے بولا۔ لال بنگلے چلو گے ہلال بنگلے مشہور محلہ تھی۔ یکہ والا تیار ہو گیا۔ اور آٹھ بجتے بجتے ڈاکٹر صاحب کی فٹن سباما کے دروازے پر پہنچی۔ یہاں اس وقت چاروں طرف اُسکی تلاش ہو رہی تھی۔ کہ رفتاً وہ متانت کے ساتھ قدم بڑھاتا نہر گیا اور بولا پردہ کرو۔ ڈاکٹر صاحب آتے ہیں۔

سباما اور سوسیلہ دونوں چونک پڑیں۔ سمجھ گئیں کہ یہ ڈاکٹر صاحب کو بلائے چلا گیا تھا۔ سباما نے فرطِ محبت سے اُسے گود میں بٹھالیا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر کر پوچھنے لگی کیا کیلے چلے گئے تھے۔ تمہیں راستہ کیسے معلوم ہوا۔ ڈر نہیں لگا۔ ہم سے بتلایا بھی نہیں۔ یوں ہی چلے گئے۔ تم کھو جاتے تو میں کیا کرتی۔ ایسا لال کہاں پاتی۔ یہ کہہ کر اُس نے بیٹے کو بار بار چوم پرتاپ ایسا خوش تھا گویا امتحان میں پاس ہو گیا ہے۔ ذرا دیر میں پردہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب آئے سباما کی بغن دیکھی۔ تشفی دی۔ پرتاپ کو گود میں بٹھا کر باتیں کرتے رہے۔ دوا ساتھ لیتے آئے تھے۔ اُسے پلانے کی تاکید کر کے لوبے اپنے بنگلے کو واپس گئے۔ مگر چونکہ بُجھار پڑا تھا۔ پورے مہینہ بھر سباما کو کڑوی کڑوی دوائیں ہنی پڑیں۔ ڈاکٹر صاحب دونوں وقت آتے۔ اور ایسی توجہ اور شفقت سے پیش آتے گویا سباما انکی بہن ہے۔ ایک دفعہ سباما نے ڈرتے ڈرتے فیس کے روپے ایک طشتری میں رکھ کر پیش کئے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے انھیں ہاتھ

تک نہ لگایا۔ صرف اتنا کہا، ”اسے میری طرف سے پرتاپ کو دیدیجئے گا۔ وہ ہاتھوں ہاتھوں مرے جاتا ہے۔ پیر گاڑی مول لے لگا۔“

برجن اور اُسکی ماں دونوں اٹھوں پہر اُسکی تیار داری کے لئے حاضر ہئیں۔ ماں چاہے سناہلی بھی کر جائے۔ مگر برجن وہاں سے ایک دم کو بھی نہ ہٹتی۔ دوا پلائی۔ پانی دیتی۔ جب سُباما کی طبیعت ہلکی ہوتی تو اُس سے بھولی بھولی باتیں کر کے اُسکا دل سہلائی کھیلنا کو مناسب چھوٹ گیا جب سُباما بہت اصرار کرتی تو ذرا دیر کے لئے پرتاپ کے ساتھ باغچے میں کھیلنے چلی جاتی۔ چراغ جلتے ہی پھرا بیٹھی۔ اور جب تک مارے نیند کے جھک جھک نہ پڑتی وہاں سے اُٹھنے کا نام نہ لیتی۔ بلکہ اکثر وہیں سو جاتی۔ رات کو آدمی کو وہیں اُٹھا کر گھر لے جاتا۔ نہیں معلوم اُسے ایسی کیا دھن سوار ہو گئی تھی۔

ایک دن برج رانی سُباما کے سرھانے بیٹھی نیکھا بھل رہی تھی۔ نہ جانے کس خیال میں غرق تھی۔ آنکھیں دیوار کی طرف لگی ہوئی تھیں اور جب طرح درختوں پر چاندنی لہراتی ہے اسی طرح ہلکی ہلکی سُکراہٹ اُسکے لبوں پر لہا رہی تھی۔ اُسے مطلق خبر نہ تھی کہ کچھ میری طرف تاک رہی ہیں۔ دفعتاً اُسکے ہاتھ سے نیکھیا چھوٹ پڑی۔ جون ہی وہ اُسے اُٹھانے کے لئے جھمکی کر سُباما نے اُسے گلے لگالیا اور مچکا کر پوچھا، ”برجن بیج بتلاؤ۔ تم ابھی کیا سوچ رہی ہیں؟“

برجن نے سر جھکالیا اور کچھ شرماکر بولی ”کچھ نہیں۔ تم سے نہ بتلاؤں گی۔“

سُباما۔ ”مچکا کر“ میری ابھی برجن۔ بتا دے کیا سوچتی تھی؟“

برجن سدجھاتے ہوئے، ”سوچتی تھی کہ... جاؤ ہندو مت... نہ بتلاؤں گی۔“

سُباما۔ ”اچھا لے نہ ہندوئی۔ بتاؤ۔ لے یہی تو اب اچھا نہیں لگتا۔ پھر میں اُنکھ بند کر لوں گی۔“

برجن۔ ”کسی سے کہو گی تو نہیں۔“

سُباہ! ہمیں کسی سے نہ کہو نگلی۔

برجن۔ سوچتی تھی کہ جب پرتاپ سے میرا بیاہ ہو جائیگا تو خوب مزے سے رہو نگلی۔

سُباہ! اُسے سینہ سے چٹالیا اور بولی ”پیارسی وہ تو تیرا بھائی ہے۔“

برجن۔ ”ہاں بھائی ہے۔ میں جان گئی تم مجھے بہنو بتاؤ گی۔“

سُباہ!۔ آج لکھو کو اُسے دو۔ اس سے پوچھوں دیکھوں کیا کہتا ہے۔“

برجن۔ ”نہیں نہیں اُن سے نہ کہنا۔ میں تمہارے پیروں پڑوں۔“

سُباہ! ”میں تو کہہ دے گی۔“

برجن۔ ”تمہیں ہماری قسم اُن سے نہ کہنا۔“



پانچویں فصل

شریفانہ زندگی کے نظارے



دن جاتے دیر نہیں لگتی۔ دو سال گزر گئے۔ پنڈت موٹے رام روز اعلیٰ الصباح

آتے۔ اور سیدھانت کو مدی پڑھاتے۔ حالانکہ اب اُنکا آنا محض رسم تھا۔ کیونکہ اس کتاب کے پڑھنے میں برجن کا دل مطلق نہ لگتا تھا۔ ایک روز منشی جی انجینیر کے دفتر سے آئے۔

کہہ میں بیٹھے تھے۔ تو کہہ جوتے کا فیتہ کھول رہا تھا کہ رُوحیا مہری مُسکراتی ہوئی گھر میں سے

نُکلی۔ اور اُنکے ہاتھ میں ایک سرسبز لہاف رکھ دیا۔ اور مُنہ پھیر کر ہنسنے لگی۔ سرنامہ پر لکھا ہوا تھا

”بُخند مت جناب بابا صاحب برسد۔“

منشی: ارے تو کسا لفافہ لے آئی۔ یہ میرا نہیں ہے۔“

مہری: سر کا بے کا تو ہے۔ کھولیں تو آپ۔“

منشی: کئے دیا۔ کوئی آدمی باہر سے آیا تھا۔“

مہری: (مسکراتی ہوئی) آپ کھولینگے تو پتہ لگھائیگا۔“

منشی جی نے حیرت میں آکر لفافہ کھولا تو یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

بابا کو برجن کا پر نام اور پالا گن پہونچے۔ یہاں آپ کی کرپا کے کٹل منگل ہے۔

آپ کا کٹل منگل شری وشنو ناتھ جی سے سدا سنایا کرتی ہوں۔ میں نے پرتاپ سے

بھاشا سیکھ لی۔ وہ اسکول سے شام کو اگر مجھے روز پڑھاتے ہیں۔ اور اب آپ ہمارے لئے

اچھی اچھی کتابیں لائیے۔ کیونکہ پڑھنا ہی زندگانی کا سکھ ہے۔ اور دیا انول چیز ہے۔ وید

پران میں اسکا جہاتم لکھا ہوا ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وڈیا دھن دل و جان سے جمع کرے۔

وڈیا سے سب دکھ دور ہو جاتے ہیں۔ میں نے کل شام کو بیتال پچپی کی کہانی جی کو سنائی تھی۔

انھوں نے مجھے ایک جُصورت گڑیا انام دی ہے۔ بہت اچھی ہے۔ میں اسکا بیاہ کر دوں گی۔

تب آپ سے روپیہ لونگی۔ میں اب پنڈت جی سے نہ پڑھونگی۔ اماں نہیں جانتیں کہ میں بھاشا

پڑھتی ہوں۔

آپ کی پیاری برجن

القاب دیکھتے ہی منشی جی کے کلیجہ میں گدگدائی محسوس ہونے لگی۔ پھر تو ایک ہی نظر میں

سارا خط پڑھ ڈالا۔ مارے خوشی کے ننگے پاؤں ہنستے ہوئے اندر دوڑے۔ پرتاپ کو گود میں

اُٹھالیا۔ اور دونوں لڑکوں کا ہاتھ پکڑے ہوئے سو سیلا کے پاس گئے اور خط دکھا کر کہا

”بوجھو کسا خط ہے؟“

سوسیلاؔ لاؤ ہاتھ میں دو۔ دیکھوںؔ

منشی جیؔ نہیں دیں سے بیٹھے بیٹھے بتاؤ۔ جلدیؔ

سوسیلاؔ بوجھ جاؤں تو کیا دو گےؔ

منشی جیؔ پچاس روپے دودھ کے دھوئے ہوئے۔

سوسیلاؔ پہلے روپیہ نکال کر رکھ دو۔ نہیں تو مکر جاؤ گےؔ

منشی جیؔ مکر نے والے کو کچھ کتا ہوں۔ ابھی روپیہ لو۔ ایسا کوئی ٹٹ پونجیا سمجھ لیا ہےؔ

یہ مکردس روپیہ کا ایک نوٹ حبیب سے نکال کر دکھایا۔

سوسیلاؔ کتنے کا نوٹ ہےؔ

منشی جیؔ پچاس روپیہ کا۔ ہاتھ میں لیکر دیکھ لوؔ

سوسیلاؔ لے لوں گی۔ کسے دیتی ہوںؔ

منشی جیؔ ہاں ہاں لے لینا۔ پہلے بتاؤ تو ہسیؔ

سوسیلاؔ آلو کا ہے۔ لائے نوٹ۔ اب میں نہ مانوں گیؔ

یہ کہہ کر وہ اٹھی اور منشی جی کا ہاتھ پکڑ لیاؔ

منشی جیؔ ایسی کیا رہزنی ہے۔ نوٹ چھینے لیتی ہوؔ

سوسیلاؔ زبان نہیں دی تھی۔ ابھی سے مکر نے لگےؔ

منشی جیؔ نننے بوجھا بھی۔ صاف دھوکا کھا گئیںؔ

سوسیلاؔ چلو چلو ہمارے کرتے ہو۔ نوٹ ہضم کرنے کی نیت ہے۔ کیوں لگو تمہارا ہی خط ہے نہ ۹

پر تپا پنے نیچی نگاہوں سے منشی جی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولائیں نے کہاں کہاں۔

منشی جیؔ شرماؤ۔ شرماؤ۔

سوسیلا۔ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اسی کا خط ہے۔ تلوگ آپس گٹھ کر آئے ہو۔“

پر تھاپ۔ ”میرا خط نہیں ہے۔ سچ۔ برجن نے لکھا ہے۔“

سوسیلا کے منہ سے بے اختیار نکلا ”برجن کا“ اور اُس نے دوڑ کر شوہر کے ہاتھ سے خط چھین لیا۔ اور بھوپک ہو کر اُسے دیکھنے لگی۔ مگر اب بھی یقین نہ آیا۔ برجن سے پوچھا کیوں بیٹی یہ تمہارا لکھا ہے۔ برجن نے سر جھکا کر کہا ہاں، یہ سنتے ہی ماں نے اُسے گلے لگا لیا۔ اب آج سے برجن کا یہ حال ہو گیا کہ جب دیکھتے قلمدان لئے بیٹھی ہے۔ اور کاغذ سیاہ کر رہی ہے گھر کے کام دھندے سے تو اسے پہلے ہی سے کچھ سروکار نہ تھا۔ لکھنے کا آنا سونے پر سہاگاہو گیا ماں اُسکی سرفرویت دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی۔ باپ بچو لا نہ سہاتا۔ سنت ہی کتا میں لاتا کہ برجن پریشان ہو جائیگی تو بڑھ ہیگی۔ اگر وہ کبھی اپنا پیر آپ دھو لیتی سی کھانا کھا کر آپ ہی ہاتھ دھوئے لگتی تو ماں مہریوں پر ہنس پڑتی۔ آنکھیں پھوٹ گئی ہیں۔ چربی چھپا گئی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے پانی اُنٹریل رہی ہے۔ اور تم کھڑی منہ تالکی ہو۔

اسی طرح دن گزرتے چلے گئے۔ برجن کا بارھواں سال پورا ہوا۔ مگر ابھی تک اُسے چاول اُبالنے تک کا شعور نہ تھا۔ چولھے کے سامنے بیٹھنے کا کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا۔ سب بامانے ایک دن اُسکی ماں سے کہا۔ ”بہن برجن سیانی ہوئی۔ کیا کچھ کُن ڈھنگ نہ سکھاؤ گی۔“

سوسیلا۔ ”کما کما۔ جی تو چاہتا ہے کہ لگا لگاؤں۔ مگر کچھ سوچ کر رہ جاتی ہوں۔“

سب بامان۔ ”کیا سوچ کر رہ جاتی ہو۔“

سوسیلا۔ ”کچھ نہیں۔ اُلکس آجاتا ہے۔“

سب بامان۔ ”تو یہ کام میرے سپرد دو۔ کھانا پکانا عورتوں کے لئے سب سے ضروری بات ہے۔“

سوسیلا۔ ابھی چولہے کے سامنے اُس سے بیٹھا نہ جائیگا۔

سُبا ما۔ کام کرنے ہی سے آتا ہے۔

سوسیلا۔ (بھیپتے ہوئے) پھول سے گال کھلا جائیں گے۔

سُبا ما۔ (ہنس کر) بلا پھول کے مڑجھاتے کہیں پھل لگا ہے۔

دوسرے دن سے برجن کھانا پکانے لگی۔ پہلے دس پانچ دن اُسے چولہے کے سامنے

بیٹھے میں سخت تکلیف ہوئی۔ آگ نہ ملتی۔ پھوکنے لگتی تو آنکھوں سے پانی بہتا۔ وہ بوئی

کی طرح الال ہو جاتیں۔ چنگاریوں سے کئی ریشمی ساڑیاں ستیا ناس ہو گئیں۔ ہاتھوں میں

چھالے پڑ گئے۔ مگر رفتہ رفتہ سب مصیبتیں رفع ہو گئیں سُبا ما ایسی نیک مزاج عورت تھی

کہ کبھی ناراض نہ ہوتی۔ ہمیشہ ہنسنے پر آمادہ رہتی۔

ابھی برجن کو کھانا پکاتے دو ماہ سے زیادہ نہ گزرے ہونگے کہ ایک دن اسے پتاپ

سے کہا ”لو مجھے کھانا پکانا آگیا۔“

پرتاپ۔ ”سچ!“

برجن۔ ”کل بچی نے میرا پکایا کھانا کھایا تھا۔ بہت خوش ہوئیں۔“

پرتاپ۔ ”تو بھی ایک دن میری بھی دعوت کرو۔“

برجن۔ (خوش ہو کر) ”اچھا کل۔“

دوسرے دن نو بجے برجن نے پرتاپ کو کھانے کے لئے بلایا۔ اُس نے جا کر دیکھا

تو چوکا لگا ہوا ہے۔ تازہ میٹھی کی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی ہے۔ اُس نے صفائی سے

بچھا ہوا ہے۔ ایک تھالی میں چاول اور چپاتیاں ہیں۔ دال اور ترکاریاں الگ الگ کٹوروں میں

رکھی ہوئی ہیں۔ لوٹا اور گلاس پانی سے بھرا ہوا موجود ہے۔ یہ صفائی اور سلیقہ دیکھ کر پرتاپ

۲۷

کسی انگریز کی ملاقات کو نہ گئے۔

بابوشیا ماچرن اگرچہ کسی معنی میں حریص شہرت نہ تھے۔ مگر اپنے نام نیک کو بدنامی کی ہوا سے بچاتے رہتے تھے۔ خاندانی اعزاز اور وجاہت پر بھی انھیں کسی قدر فخر تھا۔ اپنی وضع کے وہ بڑے رنگین مزاج آدمی تھے۔ انکی باتیں ظرافت سے بھری ہوتی تھیں۔ شام کی وقت جب وہ چند منتخب احباب کے ساتھ صحن میں بیٹھے تو انکے قہقہہ کی گونجتی ہوئی آواز باغچے سے سنائی دیتی تھی۔ نوکروں چاکروں سے وہ بہت بے تکلفی کا برتاؤ رکھتے۔ یہاں تک کہ انکے ساتھ الاؤ کے گرد بیٹھنے سے بھی عار نہ تھا۔ مگر انکا عہد کچھ ایسا اچھایا ہوا تھا کہ کسی کو انکی ان کمزوریوں سے بجا فائدہ اٹھانے کی جرات نہ ہو سکتی تھی۔ وضع قطع سادہ رکھتے۔ کوٹ پتلون سے انھیں نفرت تھی۔ بٹن دار اونچی اکچن۔ اسپرلیک ریشمی کام کی عبا۔ سیاہ شملہ۔ ڈھیلہ پاجامہ۔ اور دلی کی ساخت کا لوکدار ہوتا انکی خاص وضع تھی۔ اور انکے دھڑے بدن نسج و سفید چہرہ اور میانہ قد پر جسقدر یہ لباس زیب دیتا تھا۔ اُنکا کوٹ پتلون سے ممکن نہ تھا۔

مگر ڈپٹی شیا ماچرن کا عجب چاہے سارے شہر میں چھایا ہوا ہو۔ خود اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر انکی ایک نہ بچتی تھی۔ یہاں مسٹر شیا ماچرن کی عملداری تھی اور وہ اپنے مالک محروسہ میں مطلق العنانی کے ساتھ راج کرتی تھیں۔ نوکروں کا تقرر۔ انکی برخواستگی۔ انکی سزا۔ خانگی فرویات۔ لین دین۔ غرض ان کل امور میں انھیں سیاہ و سفید کا اختیار تھا۔ کئی برس گذرے ڈپٹی صاحب نے پریکوتی کی مرضی کے خلاف ایک مہاجن نوکر رکھ لی تھی۔ مہاجن ذرا نگیلی تھی۔ پریکوتی اپنے شوہر کی اس مداخلت سے بیچارہ سی برہم ہوئی کہ ہفتوں تک کوپ بھون میں بیٹھی رہی۔ آخر زچ ہو کر ڈپٹی صاحب نے مہاجن کو رخصت کر دیا۔

انہیں پھر خانگی معاملات میں رخنہ ڈالنے کی کبھی ہمت نہ پڑی حالانکہ بیچارے بہت متقی اور پاک نفس آدمی تھے۔ اور اب سن بھی چالیس کے متجاوز ہو گیا تھا مگر پریمیوتی کے دل میں ابھی تک انکی نچا سے بدگمانی بنی ہوئی تھی۔ اُسکا مزاج خلقت کے حکما نہ واقع ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اُسے عجوبہ ٹی شیخی اور بڑے بول سے سخت نفرت تھی۔ جب کبھی وہ شہر میں کسی کے یہاں تقریبوں میں شریک ہونے کے لئے جاتی تو گویا ہمہ مسئلہ بات تھی کہ وہاں بد مزگی ضرور پیدا ہوگی۔ عورتوں کو بڑھ بڑھ کے باتیں بناتے دیکھ کر اُس سے ضبط نہوتا۔ برس پڑتی۔ امر حق کے اظہار سے وہ کبھی نہ چوکتی۔ چاہے اسکی باداش میں اُسے تو تو میں میں بھی کیوں نکرنا پڑے۔ اور طعنوں کے تیر چھوڑنے میں تو اسے خاص ملکہ تھا۔

منشی جی کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑا لڑکا نادھا چرن پچھلے سال وکری حاصل کر کے اس وقت مڑکی کالج میں پڑھتا تھا۔ اُسکی شادی فتح پور سیکری کے ایک رئیس کے یہاں ہوئی تھی منجھلی لڑکی کا نام سیوتی تھا۔ اُسکی شادی بھی الہ آباد کے ایک منمول گھرانے میں ہو گئی تھی۔ چھوٹا لڑکا کمل چرن ابھی تک بن بیاہ تھا۔ پریمیوتی نے بچپن ہی سے لاڈ پیار کر کے اُسے اربا بیاک اور بد شوق بنادیا تھا کہ اُسکی طبیعت پڑھنے لکھنے کی طرف ذرا بھی زائل ہوتی۔ پندرہ برس کا ہو چکا تھا۔ مگر ابھی تک سیدھا سا خط لکھنے کی بھی تمیز نہ تھی۔ میان جی بیٹھے۔ انہیں اسنے مہینہ بھر کے اندر نکال کر دم لیا۔ تب مدرسے میں نام لکھایا گیا۔ وہاں جاتے ہی اُسے بخار چڑھ آتا۔ اور در دس شروع ہو جاتا۔ اسلئے وہاں سے بھی اٹھالیا گیا۔ تب ایک ماسٹر صاحب اتالیقی پر مامور ہوئے۔ مگر اُنکے تین مہینہ کی دوران ملازمت میں کمل چرن نے مشکل سے تین سبق پڑھے ہونکے آخر ماسٹر صاحب بھی رخصت ہوئے۔ تب ڈپٹی صاحب نے خود پڑھانے کی ٹھانی۔ مگر ایک ہی ہفتہ میں انہیں کئی بار کمل کا

سرہانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ گواہوں کے بیانات اور وکلاء کی جرحوں کی سہ تک پہنچنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا کسی بدشعوب لڑکے کے دل میں تعلیم کی رغبت پیدا کرنا۔ پریسکوٹی نے اس مار دھار پر ایسی دلدوزیاں بھائی کر آخر ڈبٹی صاحب نے بھی جھلا کر چھوڑ دیا۔ کھلا کچھ ایسا قبل صورت۔ ایسا نازک بدن اور شیریں زبان تھا کہ ماں اُسے سب لڑکوں سے زیادہ چاہتی۔ اُسکی ناز برداریوں نے کھلا کو کنگو سے بازی۔ کبوتر بازی۔ اور اسی قبیل کے دوسرے مشاغل کا دلدادہ بنا دیا تھا۔ صبح ہوئی اور کبوتر اڑائے جانے لگے۔ بیروبا کے جوڑ چھوٹنے لگے۔ شام ہوئی اور کنگو کے لمبے لمبے چوچ ہونے لگے۔ کچھ دنوں سے جوئے کا چمکا بھی پڑ چلا تھا۔ آئینہ کنگھی اور عطریل میں تو گویا اُسکی جان بستی تھی۔ سن ابھی کچھ نہ تھا۔ مگر شہمدوں کے فیض صحبت سے نظر مازی میں بھی شہرہ آفاق تھے۔

پریسکوٹی ایک دن سببا سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ وہاں اُسے برج رانی کو دیکھا۔ اور اُسیدن سے اُسکا جی للچا ہوا تھا کہ اگر یہ ہو بنکر میرے گھر میں آئے تو گھر کے بھاگ جاگ اٹھیں۔ ایک راز داں عورت کے ذریعہ سے سوسیلہ پر اپنا عندیہ ظاہر کیا۔ برج کبوتر حوال سال شروع ہو چکا تھا۔ میاں بیوی میں شادی کے متعلق صلاح و مشورہ ہو رہا تھا۔ پریسکوٹی کا عندیہ پاکر دونوں بھوے نہ سمائے۔ ایک تو جان پہچان کے آدمی۔ پھر عالی خاندان۔ لڑکا ذہین اور تعلیم یافتہ۔ مورد وثی جاندا کثیر۔ اگر ان سے ناتا ہو جائے تو کیا پوچھنا چٹ پٹ باقاعدہ طور پر پیغام کھلا بھیجا۔ اس طرح اتفاقات نے آج اُس زمربیلے درخت کا بیج بویا جسے تین ہی برس میں خاندان کا خاندان تباہ کر دیا۔ مستقبل ہماری نگاہوں سے کیا پوشیدہ رہتا ہے۔

جوں ہی پیغام پہنچا پریسکوٹی پھولی نہ سمائی۔ ساس نندا اور بہو بہ

”ہو۔“ (چندرا) کیوں اماں کیا آپ اسی سال بیاہ کر گئی؟“

”پریموتی“۔ اہ کیا۔ تمہارے لالہ جی کی ماننے کی دیر ہے۔“

”ہو۔“ کچھ تلک جہیز بھی ٹھہرا؟“

”پریموتی“۔ تلک جہیز ایسی لڑکیوں کے لئے نہیں ٹھہرا جاتا۔ جب ترازو میں لڑکی لڑکے

کے برابر نہیں ٹھہرتی تب جہیز کا پانسنگ بنا کر اُسے برابر کر دیتے ہیں۔ ہماری برج رافنی کلا

سے بہت بھاری ہے۔“

”سیوتی“۔ کچھ دنوں گھر میں خوب چل بیل رہیگی۔ بھابھی گیت گائیں گی۔ میں ڈھول بجاؤں گی

کیوں بھابھی؟

چندرا۔ مجھے ناچنا گانا نہیں آتا۔

چندرا کی آواز ذرا بھاری تھی۔ جب گاتی تو راگ میں بے سربین آ جاتا۔ اس لئے

اسے گانے سے چڑھ تھی۔

”سیوتی“۔ یہ تو تم آپ ہی کو۔ تمہارے گانے کی سنسار میں دھوم ہے۔“

چندرا جل گئی۔ تیکھی ہو کر بولی ”جیسے نایک گارو دسرو نکو لُجھانا ہو وہ ناچنا گانا کیسے۔“

”سیوتی“۔ تم تو ذرا سی دل لگی میں ناراض ہو جاتی ہو۔ ذرا وہی گیت گاؤ۔ ”تم تو شام بڑے بے کھجڑو“

اس وقت سُننے کا بہت جی چاہتا ہے۔ مہینوں سے تمہارا گانا نہیں سنا۔

چندرا۔ ”تمہیں گاؤ۔ تمہارا گلا کوٹلوں کا سا ہے۔“

”سیوتی“۔ لے اب تمہاری یہی شرارت اچھی نہیں لگتی۔ میری بھابھی۔ ذرا گاؤ۔“

”میں اس وقت ہرگز نہ گاؤں گی۔ کیا مجھے کوئی ڈومنی مقرر کیا ہے۔“

تو بلا گیت سُننے کن تمہارا بیچھانہ چھوڑو گئی۔“

سیوٹی کی آواز نہایت دلکش اور سریلی تھی۔ خط و خال بھی دل فریب و چمکی رنگ۔
 ریشلی آنکھیں۔ پیازی رنگ کی سلاخی اُمپر خوب کھل رہی تھی۔ آپ ہی آپ غمتلنے لگی۔
 تم تو شمیم برسے بے کھسب ہو۔۔۔۔۔ تم تو شمیم ..
 آپ تو شمیم ہیو دودھ کے گلہڑا + میری تو پانی بد گھر۔ پانی پر گھر ہو۔

تم تو شمیم

دودھ کے گلہڑا پر بے اختیار منہس پڑی۔ پر کیوٹی بھی مسکرائی۔ مگر چندرا ہانسی
 ہو گئی۔ بولی بلا ہنسی کی ہنسی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟
 سیوٹی: ”اوہ ہم تم ملکر گائیں“
 چندرا: ”کوئل اور چیل کا کیا ساتھ؟“
 سیوٹی: ”غصہ تمہاری ناک پر رہتا ہے۔“

چندرا: ”تو ہمیں کیوں چھیڑتی ہو۔ ہمیں گانا نہیں آتا تو کوئی تم سے شکایت کرنے تو نہیں جانتا۔“
 ”کوئی“ کا اشارہ رادھا چرن کی طرف تھا۔ چندرا میں چاہے اور کوئی گنہ ہو۔
 مگر مشورہ کی خدمت دل و جان سے کرتی تھی۔ اُنکا ذرا سرو جھکا۔ اور اسکی جان بھلی لڑکوں
 گھر آنے میں ذرا دیر ہوئی۔ اور یہہہ بیقرار ہونے لگی۔ جب سے وہ ڈر کی چلے گئے تب سے
 چندرا کا بننا بولنا سب چھوٹ گیا تھا۔ اسکی خوشی اُنکے ساتھ چلی گئی تھی۔ انھیں
 باتوں نے رادھا چرن کو بیوی کا شید باندیا تھا۔ حُسن اور سلیقہ اور گُن۔ یہہ سب محبت
 کے مقابلے میں بہت ارزاں چیزیں ہیں محبت حُسن اور سلیقہ اور گُن کی سب خامیاں
 پوری کر دیتی ہے

سیوٹی: ”شکایت کیوں کر لگیا۔ کوئی تو تم پر دل و جان سے ریجھا ہوا ہے۔“

چندرا۔ ”ادھر کئی دن سے خط نہیں آیا۔“
 سیوتی۔ ”تین چار دن ہوئے ہونگے۔“
 چندرا۔ ”تم سے تو ہاتھ پیر جوڑ کے ہار گئی تھم لکھتی ہی نہیں۔“
 سیوتی۔ ”اب وہی باتیں روز روز کون لکھے۔ کوئی نئی بات ہو تو لکھنے کا جی چاہے۔“
 چندرا۔ ”آج شادی کا حال لکھ دینا۔ لاؤں قلم دوں۔“
 سیوتی۔ ”مگر ایک شرط پر لکھو گی۔“
 چندرا۔ ”بتاؤ۔“
 سیوتی۔ ”تمہیں شام والا گیت گانا پڑیگا۔“
 چندرا۔ ”اچھا گا دوں گی۔ ہنسنے ہی کا جی چاہتا ہے نہ۔ ہنس لیتا۔“
 سیوتی۔ ”پہلے گا دو تو لکھوں۔“
 چندرا۔ ”نہ لکھو گی۔ پھر باتیں بنائے لگو گی۔“
 سیوتی۔ ”تمہاری قسم لکھ دوں گی۔ گاؤ۔“
 چندرا گلے لگی۔

تم تو شیا م بیوہ دھڑکے گلہڑ + میری تو پانی پے گجر پانی پے گجر ہو
 تم تو شیا م بڑے بے کھڑ
 آخری الفاظ کچھ اس بے سُرے پن سے نکلتے تھے کہ ہنسی کا ضبط کرنا محال تھا۔
 سیوتی نے بہت روکا۔ مگر ہنسی نہ رک سکی۔ ہنسنے ہنسنے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔
 چندرا نے دوسرا بند گایا۔

آپ تو شیا م رکھو دو دو گتیاں دُگائیں + میری تو اپنی پے گجر۔ اپنی پے گجر ہو۔ تم تو شیا

لغیاں پر سیوتی ہنتے ہنتے لوٹ گئی۔ چند راتے آبدیدہ ہو کر کہا ”اب تو خوب ہنس چکیں۔ لاؤں قلم و دوات“

سیوتی۔ ”ہنس نہیں ابھی ذرا ہنس لینے دو“

سیوتی ہنس ہی رہی تھی کہ بالو کلا چرن یاہرے تشریف لائے۔ پندہ سولہ برس کا سن تھا۔ گورا گورا گندمی رنگ۔ پھیرا بدن۔ خوشرو۔ چہرہ زرد۔ پرتکلف پوشاک زیب تن کئے۔ عطر میں بے۔ آنکھوں میں سرمہ۔ لبوں پر مسکراہٹ اور ہاتھ میں بلبل۔ آجاریا پائی پر میٹھے کئے۔ سیوتی بولی۔ کلو۔ منہ میٹھا کر او تو تمہیں خوشخبری سنائیں سنتے ہی پھر ک اٹھو۔

کلا۔ ”منہ تو تمہارا آج ضرور ہی میٹھا ہوگا۔ چاہے خوشخبری سناؤ یا نہ سناؤ۔ آج اس خیر نے وہ میدان مارا ہے کہ بایہ و شاہد“

یہ لکر کلا چرن نے بلبل کو انگوٹھے پر بٹھالیا۔

سیوتی۔ ”میری خبر سنتے ہی نلچنے لگو گئے“

کلا۔ ”تو بہتر ہے آپ نہ سنائیے۔ میں تو آج یوں ہی نالچ رہا ہوں۔ اس خیر نے آج ناک کھلی۔ سارا شہر رنگ رہ گیا۔ نواب منے خاں بہت دنوں سے ایجناب کی آنکھوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ ایک مہینہ ہوتا ہے میں اُدھر سے نکلا تو آپ فرمانے لگے میاں کوئی چھاتیلر ہو تو لاؤ۔ مودو جو بچیں ہو جائیں۔ یہ لکر اپنے اپنا پڑا نابلل دکھایا۔ میں نے عرض کیا بندہ نواز۔ ابھی نہیں۔ مگر ایک مہینہ میں انشا اللہ آپ سے ضرور ایک جوڑ ہوگی۔ اور بد بدر۔ آج آغا شیر علی کے کھانا میں بدان کی ٹھیری بچپاس بچپاس روہی کی بازی تھی۔ لاٹھوں آدمی جمع تھے۔ نواب صاحب کا بلبل جہان دیدہ یقین مانو سیوتی کجمنت کبوتر کے برابر تھا۔ مگر جس وقت یہ بچھا چلا ہے تو اسکی اٹھی ہوئی گردن مستانہ چال اور گٹھیلے پن پر لوگ واہ واہ کرنے لگے۔ جاتے ہی

جاتے اپنے اُسکا ٹیٹو ایسا مگر وہ بھی محض پھولانہ تھا۔ سارے شہر کے بلبوں کو سرکے ہوئے۔ نورے لات چلائی۔ اسنے خالی دی۔ اور پھر جمپٹ کر اُسکی چوٹی دبائی۔ اُسنے پھر جوٹ کی۔ سیر نیچے آیا۔ چوڑے غل مچ گیا۔ مار لیا مار لیا۔ تب تو ایجا نب کو بھی غصہ آیا۔ ٹوٹ کر جو لکارتا ہوں تو یہیہ ادب اور وہ نیچے دبا ہوا۔ پھر تو اُسنے ہزار ہزار سرٹکا کنا دیر آجائے۔ مگر اس شیرنے ایسے دابا کر سر نہ اٹھانے دیا۔ نواب صاحب خود موجود تھے بہت پیچھے چلائے۔ مگر کیا ہو سکتا ہے۔ اسنے اُسے ایسا دبوچا تھا جیسے باز پھڑی کو۔ آخر کینجٹ بگٹ بھاگا۔ اسنے پالی کے اُس سرے تک پیچھا کیا۔ مگر نہ پاسکا۔ لوگ حیرت سے دنگ رہ گئے۔ نواب صاحب کا تو پہرہ فٹ ہو گیا۔ ہوا تیاں اڑنے لگیں۔ روپیہ ہارنے کی تو انھیں کچھ پرواہ نہیں لاکھوں کی آمدنی ہے۔ مگر شہر میں جو انکی ڈھاک بندھی ہوئی تھی وہ جاتی رہی۔ روتے ہوئے گھر کو سدھارے سنتا ہوں یہاں سے جاتے ہی اپنے ببل کو زندہ دفن کر دیا۔

یہ کہہ کر کلا چرن نے جیب کھنکھائی۔

سیوتی۔ ”تو پھر کھڑے کیا کر رہے ہو۔ اگر وہاں کی دوکان پر آدمی بھیجو۔“

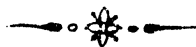
کلا۔ ”تمہارے لئے کیا لافل بجا بھی ہے؟“

سیوتی۔ ”دودھ کے کُلمر۔“

کلا۔ ”اور بھیتا کے لئے؟“

سیوتی۔ ”دودھ لٹیاں۔“

یہ کہہ کر دونوں قہقہے لگانے لگے۔



ساتویں فصل

سرد مہری محبت کو بھلا نہیں سکتی



سببا مادل وجان سے شادی کی تیاریوں میں معروف ہو گئی۔ صبح سے شام تک شادی ہی کے دھندوں میں ابھی رہتی۔ سو سیلا لونڈیوں کی طرح اُسکے حکم کی تعمیل کیا کرتی۔ منشی سیمون لال صبح سے شام تک بازار کی خاک چھانتے رہتے۔ اور برجن جیکے لئے یہ سب تیاریاں موراہی تھیں اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی رات دن رویا کرتی۔ کسی کو اتنی فرصت بھی نہ تھی کہ دم بھر کو اسکول بھلائے۔ یہاں تک کہ پرتاپ بھی اب اُسکی صحت سے بیزار نظر آتا۔ وہ اندلوں بہت اُداس رہتا تھا۔ سویرے کا نکلا ہوا شام کو گھر آتا۔ اور اپنی منڈیر پر چپ چاپ جا بیٹھتا۔ برجن کے گھر جانکی تو اُسے قسم سی کھالی تھی۔ بلکہ جب کبھی وہ آتی ہوئی دکھائی دیتی تو چپکے سے سرک جاتا۔ یا اگر کہنے سننے سے بیٹھتا بھی تو کچھ اس طرح منہ پھیر لیتا۔ اور ایسی خشکی سے پیش آتا کہ برجن رونے لگتی۔ اور سببا ماسے جا کر کہتی تھی تلو مجھے ناراض نہیں۔ میں بلاتی ہوں۔ نہیں بولتے۔ تم جھکر منادو۔ یہ کہہ کر وہ مچل جاتی۔ اور سببا کا آ پھل پکڑ کر کھینچتی ہوئی پرتاپ کے گھر لاتی۔ جیسے کوئی فریادی اپنے حمایتی کو ساتھ لائے مگر پرتاپ دونوں کو دیکھتے ہی غل بھاگتا۔ برج مانی دواڑہ کھانسیکے پیچھے پیچھے یہ کہتی ہوئی آتی کہ تلو ذرا سن لو۔ ذرا سن لو۔ تمہیں ہماری قسم ذرا سن لو۔ مگر جب وہ نہ سنتا۔ اور نہ منہ پھیر کر دیکھتا تو بیچارہ لڑکی زمین پر بیٹھ جاتی۔ اور خوب پھوٹ پھوٹ کے روتی۔ اور کہتی یہ مجھے کیوں روٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے تو انھیں کبھی کچھ نہیں کہا۔ سببا ماسے سینہ سے لگا لیتی اور سمجھاتی بیٹی جلدی

دو۔ لٹو پائل ہو گیا ہے۔ اُسے بیٹھ کی اس سر دھری کا کچھ کچھ راز معلوم ہو چلا تھا۔
آخر شادی کو صرف پانچ دن رہ گئے۔ عزیز واقارب دور و نزدیک سے آنے لگے۔
برجن کو باہر نکلنے کی ممانعت ہو گئی۔ کلنگن بندھ گیا۔ انگن میں خوبصورت منڈوا بچا گیا۔ یہ
کچے دھاگے کا کلنگن پاک فرائض کی ہتھکڑی ہے جو کبھی ہاتھ سے نہ نکلیگی اور یہ منڈوا
اُس محبت و شفقت کے سایہ کی یادگار ہے جو مرتے دم تک سر سے نہ اٹھیکا۔ آج شام کو
سُبا۔ سوسلا۔ مہراجین سب کی سب ملکر دیوی جی کی پوجا کرنے گئیں۔ مہراں اپنے
دھندوں میں لگی ہوئی تھیں۔ برجن گہرا کر اپنے کمرہ سے نکلی۔ اور پرتاپ کے گھر پہنچی۔
جو طرف سناٹا چھایا ہوا تھا مرن پرتاپ کے کمرے میں دھندھلی روشنی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔
برجن کمرہ میں داخل ہوئی تو کیا دیکھتی ہے کہ میز پر لمپ روشن ہے۔ اور پرتاپ ایک کٹری چلا پانی
پر پڑا سو رہا ہے۔ دھندلی روشنی میں اُسکا چہرہ بہت پڑ مردہ اور مغموم نظر آتا تھا چیزیں
سب اُدھر اُدھر بے قرینہ پڑی ہوئی ہیں فرش پر نونوں گرد جمع ہو گئی ہے۔ کتابیں پھیلی ہوئی
ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کمرہ کو کسی نے مہینوں سے نہیں کھولا۔ یہ وہی پرتاپ
ہے جو صفائی پر جان دیتا تھا۔ برجن نے چاہا اُسے جگا دوں۔ مگر پھر کچھ سوچ کر زمین سے
کتابیں اٹھا اٹھا کر الماریوں میں رکھنے لگی۔ میز پر سے گرد بھاڑی۔ تصویروں کے
مُنہ پر سے گرد کی نقاب اٹھائی۔ دفعۃً پرتاپ نے کروٹ بدلی اور اُسکی زبان سے یہ
الفاظ نکلے ”برجن میں تمہیں بھول نہیں سکتا“ پھر ذرا دیر کے بعد ”برجن! کہاں جاتی
ہو۔ یہیں بیٹھو“ پھر کروٹ بد لکر ”نہ بیٹھو گی۔ اچھا جاؤ۔ میں بھی تم سے نہ بولوں گا“ پھر ذرا ٹھہر
کر ”اچھا جاؤ دیکھیں کہاں جاتی ہو یہ لکروہ لپکا۔ جیسے کسی بھاگتے ہوئے آدمی کو پکڑ لیا ہو۔
برجن کا ہاتھ اُسکے ہاتھ میں آگیا۔ اسکے ساتھ ہی آنکھیں کھل گئیں ایک منٹ تک اُسکی

بے معنی نکلیں۔ برجن کے چہرہ پر گڑی رہیں۔ پھر چونک کر اٹھ بیٹھا اور برجن کا ہاتھ چھوڑ کر بولا تم کب آئیں برجن۔ میں ابھی تمہارا خواب دیکھ رہا تھا۔

برجن نے بولنا چاہا۔ مگر گلا روندھ گیا۔ اور آنکھیں بھرا آئیں۔ پرتاپ نے ادھر ادھر نظر دوڑا کر پھر کہا ”کیا یہ سب تم نے سنا کیا۔“ تھیں بڑی تکلیف ہوئی ”برجن نے اسکا بھی کچھ جواب نہ دیا۔“

پرتاپ ”برجن تم مجھے بھول کیوں نہیں جانتے؟“ سر دل ہنس کر۔
 برجن نے پُر غم آنکھوں سے دیکھ کر کہا ”کیا تم مجھے بھول گئے؟“
 پرتاپ نے نادام ہو کر سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں خیالات سے بھرے زمین کی طرف تکتے۔ ہے۔ پھر برجن نے بوجھا۔ ”تم مجھے کیوں ناراض ہو۔ میں نے کوئی خطا کی ہے۔“

پرتاپ ”ذہان کیوں اب تھیں دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہیں چلا جاؤں۔“
 برجن ”کیا تلو میری ذرا بھی محبت نہیں معلوم ہوتی۔ میں دن بھر رو دیا کرتی ہوں تھیں مجھے ترس نہیں آتا۔ تم مجھ سے بولتے تک نہیں۔ بتلاؤ میں نے تھیں کیا کیا کہ تم اتنا روکھ گئے۔“

پرتاپ ”میں تم سے روٹھا تھوڑے ہی ہوں۔“
 برجن ”تو مجھے بولتے کیوں نہیں؟“
 پرتاپ ”میں چاہتا ہوں کہ تھیں بھول جاؤں۔ تم امیروں سے ماں باپ امی ہیں۔ میں یتیم ہوں۔ میرا تمہارا کیا ساتھ؟“

برجن ”اب تک تو تم نے کبھی یہ حیلہ نہیں نکالا تھا۔ کیا اب میں زیادہ امیر ہو گئی۔“

یہ لکر برجن رونے لگی۔ پرتاپ بھی لیجا۔ بولا برجن۔ ہمارا تمہارا بہت دنوں
 تک ساتھ رہا۔ اب بچھڑنے کے دن آگئے۔ چند دن میں تم یہاں والوں کو چھوڑ
 کر اپنے سسرال چلی جاؤ گی۔ اسوقت مجھے ضرور ہی بھول جاؤ گی۔ اس لئے میں بھی
 چاہتا ہوں کہ تجھے بھول جاؤں۔ مگر کتنا ہی چاہتا ہوں کہ تمہاری باتیں یاد نہ آئیں۔
 وہ نہیں مانتیں۔ ابھی سوتے سوتے تمہارا ہی سہنا دیکھ رہا تھا۔“



آٹھویں فصل



ڈپٹی شیا ماچرن کا مکان آج حسینوں کے جگمگ سے اندر کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ سیوتی کی چار بہیلیاں رکنی۔ سیتا۔ رام دیی۔ چندر کنور سولہوں سنگار کئے اٹھلاتی پھرتی تھیں۔ ڈپٹی صاحب کی بہن جانی کنور بھی اپنی دولہائیوں کے ساتھ اٹا دہ سے آگئی تھیں۔ ان دونوں کا نام کملا اور اُمادیی تھا۔ کملا کا بیاہ ہو چکا تھا۔ اُمادیی ابھی کنواری تھی۔ دونوں آفتاب و مہتاب۔ منڈپ کے تلے ڈومیان اور کاسین سہاگ اور سہالاپ رہی تھیں۔ گلبیا نامن اور مہنی بارین دونوں شوخ رنگ کی ساڑیاں پہنے۔ مانگ سیٹھ ور سے بھروسے یگٹ کے کڑے پہنے چمچم کرتی پھرتی تھیں۔ گلبیا شوخ و فرنگ اور زہوان تھی۔ جمنی کا سن ڈھل چکا تھا۔ سیوتی کا کیا پوچھنا۔ آج اسپر غضب کا نکھار تھا۔ ریشمی آنکھیں فرط مسرت سے متوالی ہو رہی تھیں۔ اور گلابی ساڑی کی جھلک سے چمپی رنگ گلابی نظر آتا تھا۔ وہانی محل کی کُرتی اسپر خوب کھلتی تھی۔ ابھی ہنا کرائی تھی۔ اسلئے ناگن کی سی لٹیں شانوں پر لہرا رہی تھیں۔ چھیر ٹھچھاڑ اور جھل سے اتنی فرصت بھی نہ ملتی تھی کہ ذرا بال گوندھاے۔ گھنے باہر سنار صاف کر رہا تھا۔ ہاتھوں میں صوف کڑے تھے۔ یہ سادگی اسپر راز زور و سن سے زیادہ زیب دیتی تھی۔ مہاجن کی بیٹی مادھوی پھینٹ کا کچلے دار لنگا اپنے آنکھوں میں کابل لگائے اندر باہر ایک کئے ہوئے تھی۔ رکنی نے سیوتی سے کہا۔ "ستو تہادی بھاج کماں ہیں۔ دکھائی نہیں دیتیں۔ کیا ہلوگو

بھی پردہ ہے۔

رام دیسی۔ (مسکرا کر) پردہ کیوں نہیں۔ ہماری نظر لگ جائیگی۔

سیوتی۔ ”کمرہ میں پڑی سو رہی ہو گی۔ دیکھو ابھی کھینچے لاتی ہوں۔“

یہ مکروہ چندرا کے کمرہ میں پہنچی۔ وہ ایک معمولی سی ساڑھی پہنے۔ چار پائی پڑ پڑی دروازہ کی طرف ٹٹکی لگائے ہوئے تھی۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی سیوتی نے کہا ”یہاں کیا پڑی ہو۔ اکیلے تنہا راجی نہیں گھبراتا۔“

چندرا۔ ”اوٹھ کون جاے ابھی کپڑے نہیں بدلے۔“

سیوتی۔ ”تو بدلتی کیوں نہیں۔ سکھیاں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔“

چندرا۔ ”ابھی میں نہ بدلوں گی۔“

سیوتی۔ ”یہی ضد ابھی نہیں لگتی۔ سب اپنے دل میں کیا کہتی ہو گی۔“

چندرا۔ ”تو جتنی پڑھی تھی۔ آج ہی آنے کو لکھا تھا نہ۔“

سیوتی۔ ”اچھا تو یہ اُنکا انتظار مورا ہے۔ یہ کہتے جی یہ جوگ سادھا ہے۔“

چندرا۔ ”دوپہر تو موٹی شاداب نہ آویں گے۔“

اتنے میں کلا اور اُمادی بی دو نوں طرارے بھرتی آ پوئیں۔ چندرا نے گھونگھٹ نکال لیا۔

اور فرش پر آ بیٹھی۔ کلا اسکی پڑی نند ہوتی تھی۔

کلا۔ ”ارے! ابھی تو اُنھوں نے کپڑے بھی نہیں بدلے۔“

سیوتی۔ ”بھیا کی بات جوہ دی ہیں۔ اسی لئے یہ بھیس رہا ہے۔“

کلا۔ ”پاگل میں اُنھیں غرض ہو گی آپ آئیں گے۔“

سیوتی۔ ”اکی دنیا زالی ہے۔“

کہلا۔ ”مردوں کی محبت چاہے کتنی ہی کرے۔ مگر زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالے۔
 نہیں تو وہ شیر ہو جاتے ہیں۔ خواہ مخواہ ستانے اور جلانے لگتے ہیں۔ اگر تم انکی کچھ پروا نہ کرو۔
 اُن سے سیدھے بات نہ کرو۔ تو تمہاری ہر طرح خاطر کریں گے۔ تمہارے جان واریں گے۔ مگر جو ہی
 اُنھیں معلوم ہوا کہ اب اسکے دل میں میری جگہ ہو گئی۔ بس اُسی دن سے اُنکی نگاہ پلٹ
 جائیگی۔ سیر کو جائینگے۔ تو خواہ مخواہ دیر کر کے آئینگے۔ کھانے بیٹھیں گے تو منہ جھوٹا کر کے
 اُٹھ جائینگے۔ بات بات پر روٹھیں گے۔ تم رُوگی تو منائیں گے۔ اور دل میں خوش مونگے
 کہ کیسا نکار۔ پھانسا ہے۔ تمہارے سامنے دوسری عورتوں کی تعریف کریں گے۔ غرض تمہیں
 جلانے میں اُنھیں مزہ آنے لگیگا۔ اب میرے ہی گھر میں دیکھو۔ پہلے اننی خاطر کرتے تھے کہ کیا بناؤ۔
 ہر دم لوگوں کی طرح ہاتھ باندھے ماعز۔ پنکھا بھلنے کو موجود۔ ہاتھ سے لقمہ کھلانے کو موجود۔
 یہاں تک کہ دمسکر کر پیر دبانے سے بھی عار نہ تھا۔ بات منہ سے غلی نہیں اور پوری ہوئی۔ میں اُس
 اینٹلی تھی۔ مردوں کے والوں، بیچ کیا جانوں۔ دم میں آگنی۔ سیونی جھوٹے نہ ماننا اُسی
 دن سے اُنکی آنکھ بدل گئی لگے سیر سپاٹا کرنے۔ ایک روز روٹھ کر چل دیے۔ آہ صیحت
 کو گرجا گلے میں ڈالے۔ عطر میں بے ہوئے گھڑائے۔ پچھتے تھے کہ آج ہاتھ باندھ کر
 کھڑی ہو گئی۔ میں نے لمبی تانی تو رات بھر کروٹ نہ ہدلی۔ دوسرے دن بھی نہ بولی۔ آخر
 لالہ جی آئے۔ پیروں پر گرے۔ گرا گرائے۔ تب سے میں نے یہ بات گرہ باندھ لی ہے کہ مردوں
 سے کبھی محبت نہ جتاؤ۔

سیونی۔ ”جیسا کہ میں نے دیکھا ہے بھیا کی شادی میں آئے تھے۔ بڑے حسن کھ آدمی ہیں“
 کہلا۔ ”پارتی ان دنوں پیٹ میں تھی۔ اسی سے میں نہ آسکی تھی۔ یہاں سے گئے تو لگے
 تہندی تعریف کرنے۔ تم کبھی پان دیے گئی تھیں۔ کہتے تھے کہ میں نے ہاتھ پیر کر

بیٹھا لیا اور خوب خوب باتیں ہوئیں۔“

سیوٹی (ہنسنے) جھوٹے ہیں زمانے کے۔ لباڑیے۔ بات یہ ہوئی کہ گلیا اور جمنی دونوں کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھیں۔ اماں نے کہا وہ کھا کے گئے ہیں۔ پان بنا کے دے آ۔ میں پان لیکر گئی۔ چار پانی پر لیٹے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھے۔ میں نے پان دینے کو ہاتھ بڑھایا۔ تو آپ نے گلانی کپڑی۔ اور کہنے لگے کہ ایک بات سن لو۔ ایک بات سن لو۔ مگر میں ہاتھ چھڑا کر بھاگی۔“

کملا۔ بھلی نہ جھوٹی بات۔ دہی تو میں بھی کھوں کہ ابھی گیارہ بارہ برس کی چھو کری۔ اُسے اُسے کیا باتیں کی ہوں گی۔ مگر نہیں اپنی ہی ضد کے جائیں۔ مروڑے ڈینگے ہوتے ہیں میں نے یہ کہا میں نے وہ کہا۔ میرا تو ان باتوں سے جی جلتا ہے۔ نہیں معلوم اُنھیں اپنے اوپر جھوٹی تممت لگانے میں کیا مزہ آتا ہے۔ آدمی جو برا بھلا کرتا ہے۔ اُس پر پردہ ڈالتا ہے۔ مگر یہ لوگ کرینگے تو تھوڑا اور ڈینگ مارنے کو ہر دم تیار۔ میں تو جب سے اُنکی ایک بات بھی سچ نہیں مانتی۔“

اتنے میں گلیا نے اگر کہا تم تو یہاں بھاڑھی بتلات ہو۔ اور تمہارے کھا انگن میں بھوتی ہیں۔“

سیوٹی۔ دیکھو بھابھی اب دیر نہ کرو۔ گلیا ذرا انکے صندوق سے کپڑے تو نکال لے۔“

کملا چند اکا سنگار کرنے لگی۔ سیوٹی سیلیوں کے پاس آئی۔ رُکنی بولی واہ بہن خوب! وہاں جا کر بیٹھ رہیں۔ تمہاری دیواروں سے حسیں بولیں کیا؟۔“

سیوٹی۔ کملا بہن چلی گئیں۔ اُسے بات چیت ہونے لگیں۔ دونوں آہی ہیں۔“

رُکنی۔ لڑکوری ہیں۔“

سیوٹی۔ عین ہوئے تھے ایک پار سال مر گیا۔ دو موجود ہیں۔“

رام دیسی۔ ”مگر کاٹھی بہت اچھی ہے۔“

چندر کنور۔ ”مجھے اُنکا بانک بہت پسند آیا۔ جی چاہتا ہے بھین لوں۔“

سیتا۔ ”بانک واقعی اچھا ہے۔ دونوں بہن ایک سے ایک بڑھکر ہیں۔“

رکمنی۔ ”اگنی طبیعت۔ اُمادی مرد نہوئیں نہیں تو تم جان دینے لگتیں۔“

سیتا۔ ”دوسروں پر تو وہ جان دے جبکا دولہا کر دو۔ یہاں تو لاکھ دو لاکھ میں ایک ہے۔“

رکمنی کے شوہر زرا نگ کے گھر سے تھے۔ اور نقشہ بھی سڈول نہ تھا۔

رکمنی۔ ”صورت لیکر جاٹی نہیں باقی۔“

سیتا۔ ”وہ تو دل ہی جانتا ہوگا۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ چاہے روکھی روٹی کھانے کو ملے۔

بھونپڑے میں رہنا پڑے۔ مگر صورت دیکھتے ہی سب دکھ دور ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ بھینگی

صورت دیکھ کر بخار چڑھ آئے۔ جی متلانے لگے۔“

سیوٹی۔ ”سیتا کو ایسٹور نے برا چھادیا ہے۔ اسنے سونے کی گور پو جی تھی۔“

رکمنی (جلکر) ”گورے چمڑے سے کچھ نہیں ہوتا۔“

سیتا۔ ”تمھیں کالا ہی پسند ہوگا۔“

سیوٹی۔ ”مجھے کالا بر ملنا تو زہر کھا لیتی۔“

رکمنی۔ ”یوں کہنے کو جو چاہے کہ لو۔ مگر سچ پوچھو تو آرام کالے ہی دولہا سے ملتا ہے۔“

سیوٹی۔ ”آرام نہیں خاک ملتا ہے۔ گن سا آکے لیٹ جاتا ہوگا۔“

رکمنی۔ ”یہی تو تمہاری لڑکپن کی باتیں ہیں۔ تم جانتی نہیں خوبصورت مرد ہمیں اپنے ہی

بناؤ سنگار میں لگا رہتا ہے۔ اُسے اپنے آگے بیوی کا کچھ خیال نہیں رہتا۔ اگر عورت بچہ

خوبصورت ہے تو خیر۔ ورنہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ اُس سے بھاگنے لگتا ہے۔ وہ

سمجھتا ہے کہ میں ایسی دوسری عورتوں کے دل پر آسانی سے قابو پا سکتا ہوں۔ بیچارہ کا لاکو آدمی خوبصورت بیوی پا جاتا ہے تو سمجھتا ہے مجھے میرے کی کھان ملگنی۔ صورت کی کسر وہ پیار اور خاطر داری سے پوری کرتا ہے۔ اُسکے دل کو ہمیشہ یہ دغدغہ لگا رہتا ہے کہ میں ذرا بھی اس سے ترش ہوا تو وہ مجھے نفرت کرنے لگیگی میں اگر آدھی رات کو کھوں کہ گرم گرم علیکھلاؤ۔ تو ممکن نہیں کہ اس وقت علم کی تعین ناکریں۔ آج کسی گننے کی فرمائش کر دوں۔ تو کھر بیکر جان کر کریں۔

چندر کنور۔ دو لحا سب سے اچھا وہ جو منہ سے بات نکلتے ہی پوری کرے۔

رام دیہی۔ تم اپنی بات نہ چلاؤ۔ تمہیں تو اچھے اچھے گمنوں سے سروکار ہے۔ دولہا کی بات سنیٹا۔ نہیں معلوم کوئی اپنے مرد سے کسی چیز کی فرمائش کیونکر کرتا ہے۔ کیا لحاظ نہیں معلوم ہوتا۔ رکنی۔ تم بیچاری کیا فرمائش کرو گی۔ کوئی بات تو پوچھے۔

سیٹا۔ میرا تو انہیں دیکھ ہی کے جی بھر جاتا ہے۔ گنے کپڑے کی طرطبیعت نہیں جاتی۔ سیوٹی۔ سیٹا کا خوب جوڑ ہے۔

رام دیہی۔ جوڑ جو سچ پوچھو تو چندر کنور اور کلونت راسے کا خوب ہے۔

سیوٹی۔ یہ انہیں دباتی ہونگی تو بیچارے گھگھیا نے لگتے ہونگے۔

چندر کنور بھاری بھر کم گدا زجم کی نازنین تھی۔ کلونت راسے منحنی بود ضعیف العظام تھے۔

رام دیہی۔ اپنی قسمت کو کوستے ہونگے کہ ایسی دیوٹی کہاں سے پائی۔

چندر کنور۔ جب دیکھو بد معنی کی شکایت۔ دو چپا تیاں کھائیں جب بھی بد معنی۔ خراسا

دودھ پییں جب بھی بد معنی۔ تاک میں دم ہے۔

سیوٹی۔ بیچارے تم سے ڈرتے ہونگے۔

سیتا۔ ”انکے سامنے بچے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ چاہیں تو انھیں گود میں کھلائیں۔“
 رگمنی۔ ”بلکہ اس زمانے میں ایک تم اچھی اور ایک تمہارا دلہا۔ باقی سب بے جڑ۔ اہل۔“
 سیتا۔ ”تھیں کا ہیکو کر ڈالگتا ہے۔“

اتنے میں ایک اور نازنین جلوہ افروز ہوئی۔ گھنے سے گوندنی کی طرح لدی ہوئی۔
 پُر تکلف جو اپنے۔ حشر میں لپی۔ سرمہ سی سے لیں۔ آنکھوں سے شوخی و شرارت برس رہی تھی۔
 رام دیوی۔ ”اورانی آؤ۔ تمہاری ہی کسر تھی۔“

رانی۔ ”کیا کروں نگوئی نائن سے کسی طرح بچیا ہی نہ چھوٹتا تھا۔ کلثوم کی ماں آئی۔ تب جا کے
 جوڑا بندھا۔“

سیتا۔ ”تمہاری جاگت پر بچھا اور ہونیکوچی چاہتا ہے۔“

رانی۔ اسکا ہتھ کچھ نہ پوچھو۔ کپڑا دیے مہینہ بھر ہوا۔ دس بارہ مرتبہ درزی سی کر لایا۔ مگر
 کبھی آستین ڈھیلی کر دی۔ کبھی بخیہ بگاڑ دیا۔ کبھی جنت خراب کر دی۔ بارے ابھی چلتے
 چلتے دیکھا ہے۔“

سیوتی۔ ”الیلے بلم ہیں نہیں۔ یا کہیں گئے ہوئے ہیں۔“

رانی۔ ”میری بلا جانے۔ جیسے کنتھا گھر رہے۔ وہ بے رہے بدلیں۔“

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ مادھوی غل بچاتی ہوئی آئی پھٹا آئے۔ انکے ساتھ
 جیجا بھی ہیں۔ ادھر ہو۔“

رانی۔ ”کیا رادھا چرن آئے کیا۔“

سیوتی۔ ”ہاں چلو ذرا بھابھی کو سند یاد دے آؤں۔ کیوں رے کہاں بیٹھے ہیں؟“
 مادھوی۔ ”اُسی رے کرے میں جیجا پڑی۔ باندھے ہیں بھٹا کوٹ پہنے ہیں مجھے بھیلانے۔“

روپیہ دیا، یہ لکڑاٹنے مٹھی کھول کر دکھائی۔

رانی ستواب منہ میٹھا کر آؤ۔

سیوتی: کیا میں نے کوئی سنت مانی تھی؟

سیتا: باجھیں کھلی جا رہی ہیں۔ آنکھوں میں نشہ آ گیا ہے۔

رانی: یہ سادگی تہہ خوب پھلتی ہے۔ خاصی پری معلوم ہوتی ہو۔

سیوتی چندرا کے کمرہ میں آکر بولی: ”لو بھابھی تمہارا شگون ٹھیک آتا۔“

چندرا: کیا آگئے۔ ذرا جا کے اندر بلاؤ۔

سیوتی: ہاں مردانے میں چلی جاؤں۔ تمہارے بہنوئی صاحب بھی تو پہچانے میں۔

چندرا: باہر بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔ کسی کو بھیج کر بلا لیتیں۔ نہیں تو دوسروں سے باتیں کرنے

لگیں گے۔

یہ ایک کھڑاؤں کی آواز آئی۔ اور ادھا چرن آتے دکھائی دیئے۔ سن

چوبیس پچیس سال سے زائد تھا۔ بہت ہی خوش رو۔ مسرخ و سفید۔ انگریزی تراش کے بال۔

فرنج تراش کی داڑھی۔ کھڑی موچھیں۔ لیونڈر کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ بدن پر صرف ایک لٹھی

مینن کرتا تھا۔ آکر چار پائی پر بیٹھ گئے۔ اور سیوتی سے بولے: ”کیوں سوتو۔ ہفتہ بہرے خط

نہیں بھیجا۔“

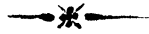
سیوتی: میں نے سوچا اب تو ابھی رہنہ ہو۔ کیا خط بھیجوں۔“

یہ لکڑ سیوتی وہاں سے کھسک گئی۔ چندرا نے گھونگٹ اٹھا کر کہا: ”وہاں جا کر کھجور کھاؤ۔“

ادھا چرن (گلے سے لگا کر) جب ہی سیکڑوں کو سسے دوڑا چلا آتا ہوں۔“

نویں فصل

بارات کی رخصتی



بارات دھوم دھام سے گئی۔ اور تین دن مقیم ہی۔ شب و روز عیش و مسرت کے جلے ہوتے رہے۔ پہلے دن آدمی رات کی وقت منڈپ کے نیچے شادی کے مراسم ادا کئے گئے۔ تمام باراتی فرشی پر بیٹھے۔ برجن ایک شنگنی رنگ کی ساڑی پہنے لباسا گھونگھٹ نکلے آئی۔ اور کلما چرن کے بفل میں بٹھائی گئی۔ ہون ہوا۔ سنسکرت کے اشوک پڑھ گئے جو دو لھا دلھن دلھن کے سمجھ میں بالکل نہ آئے۔ عورتوں نے سہاگ کے گیت گائے۔ پھر دو لھا دو لھن نے ہون کند کاسات بار طواف کیا۔ اسکے بعد دو لھا کہہ پیش گیا۔ جہاں عورتوں نے اُسے برجن کا جھوٹا پان کھلایا۔ تاکہ وہ ہمیشہ بیوی کا غلام بنا رہے۔ اُس سے غزل پڑھنے کی فرمائش کی جسکی تعمیل وہ نہ کر سکا۔ پھر اُسکے وضع و قطع اور حسب و نسب کی حنفی اُڑائی۔ اُسکی ماں کو اور باپ کو اور بہنوں کو خدا معلوم کیسی کیسی بخش گالیاں دیں جو دو لھا کو ذرا بھی ناگوار نہ معلوم ہو گیا بلکہ وہ خوش ہوا ہو کر مستار رہا۔ دوسرے دن دس بجے کلیوا کا رسم ہوا۔ نو شمع خاص خاص رشتہ داروں کے آگن میں بیٹھا۔ باسی پوریاں اُسکے سامنے ایک طشت میں لائی گئیں۔ منشی سیمون لال نے پانچ اشرفیاں تھالی کے پاس رکھ دیں۔ اور چمکا کر کھانا کھاؤ۔ مگر نوشہ نے ہاتھ نہ بڑھایا تب ایک سوئے کی انگوٹھی ایک دو شالہ چمپریں کام بنا ہوا تھا۔ ایک چاندی کا گلاس۔ دو چاندی کے کٹورے اور کچھ برتن لاکر رکھے گئے۔ تیرہ بجی نوشہ

نے پوریوں کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ سچوٹ لال نے رادھا چرن کی طرف دیکھ کر کہا بابو صاحب۔ اب آپ کھانے کی اجازت دیجئے۔ بابو صاحب نے صبر کر کہا میں نے منہ تھوڑا ہی کیا ہے۔ کھاتے کہیں نہیں۔ کلو کھا لو۔ کلو نے بھائی کی طرف دیکھا۔ مگر بجائے اجازت کے ممانعت پائی۔ سچوٹ لال گھر میں گئے۔ ایک موہن مالا اور دو انگوٹھیاں اور لائے۔ اور پھر نوشتہ سے ماحضر تناول فرمانے کی التجا کی۔ رادھا چرن نے کلا سے کہا خاموش کیوں بیٹھے ہو۔ جو کچھ عرض کرنا ہو صاف صاف دیوان صاحب سے کرو۔ کلا کے بہنوئی پران ناتھ نے کمانوشہ کی طرف سے میں ایک گھوڑے کی درخواست کرتا ہوں۔ منشی جی پھر گھوٹیں گئے۔ سببا سے کہا یہ لوگ پورے ڈاکو ہیں۔ دو ڈھانی سوڈا کار گئے۔ اب سواری کے لئے گھوڑا مانگتے ہیں۔ سببا نے جواب دیا گھوڑا مانگتے ہیں گھوڑا دیجئے۔ انکی خواہش تو پوری ہو۔ منشی جی نے مجبور ہو کر اپنے ٹم کا گھوڑا دیدیا۔ تب کلا چرن نے فوالہ اٹھایا اور گن کر باج بار لقمہ منہ تک لیگئے۔ شام کے وقت بار ایتوں کی ضیافت ہوئی۔ تحلف سے کھانا رکھا گیا۔ لوگ کھانے بیٹھے۔ جو دنیاں اندر گانے لگیں۔

آپ قوالہ نیتے میں آئے۔ میا کے دے آئے۔ ارے ہنا کے دے آئے

بھو بھی تمہاری مد کی ماتی۔ اُسکو نہ کیوں لے آئے۔ کسے سو نہ آئے۔

منشی پیارے لال نے فرمایا پران ناتھ گالیوں کے از حد مشتاق ہیں۔ دوسروں نے دوسرے گیت میں انکی خبر لی۔

پران ناتھ بابو تم ہوا بھی نادان۔

ہمن تملدی بہت سیانی۔ گھر گھر موت کھان۔ تم ہوا بھی نادان

سج پڑ سکے نس دن آتے۔ دس دس سجن سجان۔ تم ہوا بھی نادان

ڈپٹی شیا ماچرن نے فرمایا پیارے لال کو کیوں چھوڑتی ہو۔ انکے بہن کا نام چمپا ہے۔ ڈو مینوں نے گایا۔

چمپا تیری کلیاں بہت سُہانی۔ رنگ تیرا مجھے بھایا۔ رنگ تیرا مجھے بھایا۔

تیری صورتیا جت سے نہ اُترے۔ تو نے مجھے اپنا یا۔ رنگ تیرا مجھے بھایا۔

اسی طرح فرمائشیں کر کر کے لوگ گالیاں سُنا سکے۔ کوئی باقی نہ بچا۔ یہاں تک کہ گاتے

گاتے ڈو مینوں کا جی اُگتا گیا۔ مگر سُنے والوں کو سیری نہوئی۔ منشی پیارے لال نے پھر

تازہ فرمائش کی۔ ڈو مینوں نے فحش گالیاں دینی شروع کیں۔ آخر آٹھ بجتے بجتے کھانا ختم

ہوا۔ تیسرے دن رخصتی کا وقت تھا۔ علی الصباح باراتی اصحاب منڈپ کے نیچے جمع ہوئے۔

منشی سہیون لال اور انکے رشتہ دار بارایتوں سے بے لگلی ہوئے۔ نو بجتے بجتے باران رخصت

ہو گئی۔ آئی تھی کس شان سے گئی بالکل اس طرح جیسے کوئی شکست خوردہ فوج۔ گانوں نے

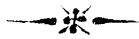
رخصتہ آنے کے گیت گائے۔ منشی شیا ماچرن نے گالی گانے کے لئے ایک اشرفی انعام

دی۔ کھلا چرن اندر گئے ماس نے چھاتی سے لگا یا پلٹے وقت پانچ اشرفیاں نذر کیں۔

شادی بڑی خوبی سے انجام کو پہنچی۔ شہر میں چاروں طرف واہ واہ کی دھوم مچ گئی۔

دسویں فصل

حسد



پرتاپ چند نے برجن کے گھر آنا جانا شادی کے کچھ دن پہلے ہی سے ترک کر دیا۔
 تنہا شادی کے کسی کام میں نہ شریک ہوا۔ حتیٰ کہ محل میں بھی نہ گیا۔ مغموم صورت بنائے۔
 منہ لٹکائے اپنے کمرہ میں بیٹھا رہا۔ منشی سیمون لال۔ سوسیلہ۔ سُباما سب خوشامدیں کر کے
 ہار گئے۔ مگر اُسے بات کی طرف رخ نہ کیا۔ آخر منشی جی کبیدہ خاطر ہو گئے۔ اور پھر
 اُس سے کچھ نہ کہا۔ یہ کیفیت شادی کے ہونے تک تھی۔ شادی کے بعد سے تو اُس نے
 اُدھر کا راستہ ہی ترک کر دیا۔ در سے جاتا تو اسطرح کتڑا کر نکل بھاگتا گویا سامنے کوئی شیر
 بیٹھا ہوا ہے۔ یا جیسے تقاضا کرے نوالے مہاجن کے سامنے سے مقروض آدمی نظریں
 بچا کر نکل جاتا ہے۔ برجن کی تو پرچھائیں سے بھاگتا۔ اگر کبھی اُسے اپنے گھر میں دیکھ پاتا تو اندر
 قدم نہ رکھتا۔ ماں سمجھاتی بیٹا تم برجن سے بولتے چالتے کیوں نہیں۔ کیوں اُس سے من مٹاتا
 کئے ہوئے ہو۔ وہ آگر گھنٹوں روتی ہے۔ کہ میں نے کیا کیا کہ جس سے یہ ناراض ہو گئے۔
 دیکھو تم اور وہ کتنے دنوں تک یکساں رہے ہو ستم اُسے کتنا پیار کرتے تھے۔ یکا یک تم کو کیا پر گیا۔
 اگر تم اسی طرح روٹے رہے تو غریب لڑکی کی جان پر بجا نیگی۔ سو کھ کر کاٹا ہو گئی ہے۔ ایشور
 جانتا ہے مجھے اُسے دیکھ کر ترس آتا ہے۔ سو اے تمہارے ذکر کے اُسے جیسے کوئی دوسری
 بات ہی نہیں معلوم۔ پرتاپ آنکھیں نیچے کئے ہوئے یہ سب سُنتا۔ اور چپ چاپ سر کر جاتا۔

پر تاپ اب کس نہ بچ نہ تھا۔ اُسکی زندگی کے پودے میں شباب کی کوہلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اُسنے بہت دنوں سے اُسی وقت سے جبکہ اُسنے ہوش سنبھالا۔ اپنے طفلانہ خوابوں میں برجن کی کوہلیں زندگی سے شیر و شکر کی طرح ملا لیا تھا۔ اُن دلفریب اور سہانے خوابوں کا اس بیدردی اور برجی سے خاک میں ملایا جانا اُسکے نازک دل کو پارہ پارہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ وہ جو اپنے خیال میں برجن کا سب کچھ تھا کمیں کا زما۔ اور وہ جس نے برجن کو ایک لمحہ کے لئے بھی خیال میں جگہ ندی اُسکا سب کچھ ہو گیا۔ اس خیال سے اُسکے دل میں جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی۔ اور جی جاہت کہ جن لوگوں نے میرا ظلم خواب یوں توڑا ہے۔ اور میری زندگی کی آرزوئیں یوں مٹی میں ملائی ہیں انھیں میں بھی جلاؤں اور سلاؤں۔ سب سے زیادہ حصہ اُسے جبرِ آتا وہ غریب سوہلا تھی۔ رفتہ رفتہ اُسکی یہ حالت ہو گئی کہ جب در سے سے آتا تو کلاچرن کے متعلق کوئی نہ کوئی روایت غرور بیان کرتا۔ خصوصاً اس وقت جبکہ سوہلا بیٹھی ہوتی۔ اس غریب کا دل دکھانے میں اُسے خاص مزہ آتا۔ اگرچہ جھوٹ بولنے کی اُسے عادت نہ تھی۔ جو کچھ وہ کتا وہ حقیقت ہوتی تھی۔ مگر نادانستہ طور پر اُسکا طرزِ بیان۔ اور اندازِ تقریر کچھ ایسا دھڑکاش ہو جاتا کہ سوہلا کے جگر میں تیر کی طرح جُھجھ جاتا۔ آج میاں کلاچرن تپائی کے اوپر کھڑے تھے۔ سر آسمان سے باتیں کرتا تھا۔ گزیر جیسا تنے بڑے کہ جب میں نے اُنکی طرف اشارہ کیا تو کھڑے کھڑے ہنسنے لگے۔ آج بڑا مزہ آیا۔ کلو نے ایک لڑکے کی گھڑی اڑا دی۔ اُسے ماسٹر صاحب سے شکایت کی۔ اُسکے قریب یہی حضرت بیٹھے ہوئے تھے۔ ماسٹر نے تلاشی لی تو آپ کے ازار بند میں گھڑی ملی۔ پھر کیا تھا۔ بڑے ماسٹر کے یہاں نالش ہوئی وہ سنتے ہی جھپٹا گئے۔ اور کوئی تین درجن فچیاں رسید کیں۔ ماسٹر

سٹر اسٹر تمام اسکول تماشہ دیکھتا تھا۔ جب تک قچیاں پڑاکیں حضرت دادو فریاد مچایا کئے۔ مگر باہر نکلتے ہی کھل کھلانے لگے۔ اور مچھلیوں پر نافو دیا چچی نہیں سنا آج لڑکوں نے میں مدرسے کے دروازے پر کھلا جرن کنٹیلہ مارتے مارتے میدم کر دیا علی بڑا۔ اُسے دن اس قسم کی وارنیں بیان کر نیکی ملیا تیں۔ سوسیلانٹی۔ اور سُن کُتر تھی۔ ہاں بڑا اس قسم کی کوئی بات برجن کے سامنے نہ کرتا۔ اگر وہ گھر میں بیٹھی بھی ہوتی تو جب تک چلی نہ جاسے یہ تذکرہ نہ چھیڑتا۔ اُسے منظور نہ تھا کہ میری کسی بات سے اسے صدمہ ہو چکے۔ پرتاپ کے روایتیوں کی تائید اتفاقہ طور پر منشی جیمون لال نے بھی بارہا کی۔ کبھی کھلا بازار میں بلبل لڑاتے مل جاتا۔ کبھی شہدوں کے ساتھ۔ سگڑ پیتے۔ پان چباتے۔ بد وضعی سے گھومتا ہوا نظر آ جاتا منشی جی جب داماد کی یہ کیفیت دیکھتے تو گھر آتے ہی بیوی پر غصہ اُٹارتے۔ یہ سب تمنا ہی کر توت ہے۔ تمھیں پہچھی ہوئی تھیں کہ گھر بردو لو اچھے میں۔ انھیں اس وقت یہ خیال نہ تھا کہ تعنا الزام سوسیلہ پر ہے۔ کم از کم اتنا ہی مجھ پر بھی ہے۔ وہ بیجاری تو چار دیواری میں بند تھی۔ اُسے کیا خبر کہ لڑکا کس قماش کا ہے۔ شامک دودیا تھوڑی ہی پڑھی تھی۔ اُسکے ماں باپ کو شریف دیکھا۔ اُسپر عالی خاندان۔ ذی رتبہ۔ راضی ہو گئی۔ مگر منشی جی نے تو محض کاہلی اور سہل انخاری کی وجہ سے بچان بنان نہیں کی۔ حالانکہ انھیں اسکے بہت سے موقع حاصل تھے۔ اور منشی جی کے بیٹا بھائی اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں جو اپنی بیجاری لڑکیوں کو اسی طرح اکھ بند کر کے کنوئیں میں ڈھکیل دیکرتے ہیں۔

سوسیلہ کو دنیا میں برجن سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہ تھی۔ برجن اُسکی جان تھی۔ اُسکا دین تھی اُسکا ایمان تھی اُسکی جان بستی تھی۔ وہ اُسکی آنکھوں کا نور اور اُسکے دل کا سرور تھی۔ اُسکا سب سے بڑا دنیاوی ارمان یہ تھا کہ میری بیجاری برجن اچھے گھر جاسے۔ اسکے ماں

سسر دیوی دیتا ہوں۔ اسکا شوہر شرافت کا پتلا اور سری راجندر جی کی طرح سبیل ہو۔
 اسپر کسی آزار کی پرچھائیں بھی نہ آئے پائے۔ اُسے مر مر کر بڑی فتنوں سے یہ لڑکی پانی
 تھنی۔ اوما سکی آردو تھی کہ اس سیلی آنکھوں والی۔ اپنی بھولی بھالی لڑکی کو مرتے دم تک
 آنکھ سے اوجھل ہونے دو تھی۔ اپنے داماد کو بلاؤ تھی۔ اپنے گھر کھونگی۔ برجن کے بچے
 ہونگے۔ انکی پرورش کرو تھی۔ داماد مجھے اماں کہیگا۔ میں اُسے لڑکا سمجھونگی۔ جس دل میں
 یہ ارمان ہوں اسپر ایسی ایسی دلزار۔ اور دھڑاٹھ باتوں کا جو کچھ اتر ہوگا ظاہر ہے۔

افسوس! عرب سوسیلہ کے سارے ارمان خاک میں مل گئے۔ اسکی ساری کڑدو
 پر ادس پڑ گئی۔ کیا سوچتی تھی اور کیا ہو گیا۔ اپنے دل کو بار بار سمجھاتی کہ ابھی کیا ہے۔ سمجھ
 آجائیگی تو یہ سب باتیں آپ ہی چھوڑ دیگا۔ مگر ایک شکایت کا زخم بھرنے نہ پاتا کہ پھر کوئی
 تازہ واردات سننے میں آجاتی۔ اسی طرح زخم پر زخم پڑتے گئے۔ اسے انہیں معلوم برجن
 کے بھاگ میں کیا بدلہ ہے۔ کیا یہ حُسن و شعور کی بتلی۔ میرے گھر کا اجالا۔ میری جسم کی جان
 اسی بد قماش۔ آوارہ شخص کے ساتھ زندگی کا یگی۔ کیا میری سفیاما اسی گدھ کے پالے
 پڑیگی! یہ سوچ کر سوسیلہ رونے لگتی اور گھٹٹوں روتی۔ پہلے برجن کو کبھی کبھی ڈانٹ ڈپٹ بھی دیا
 کرتی تھی۔ اب بھول کر بھی کوئی بات نہ کہتی۔ اُسکی صورت دیکھتے ہی اُسے رحم آجاتا۔ ایک
 لمحہ کے لئے بھی نظموں سے دور ہونے دیتی۔ اگر ذرا دیر کے لئے وہ سباما کے گھر چلی
 جاتی تو اُسکے پیچھے لگی خود بھی جا پوچھتی۔ ایسا معلوم ہوتا گویا کوئی اُسے چھینے لئے جاتا ہے۔
 جس طرح اپنے بچے کو قصائی کے بغدے کے نیچے دیکھ کر گاسے کا دیاں۔ دیاں کاٹنے لگتا
 ہے۔ اُسی طرح برجن کی مصیبت کا خیال کر کے سوسیلہ کی آنکھوں میں دنیا تار یک ہو جاتی
 تھی۔ انہوں نے برجن کو دم بھر کے لئے نگاہوں سے دور کرتے اُسے وہ قلق اور گھبراہٹ

ہوتی تھی جو چڑیا کو کھولنے سے پھوٹنے لھو جانے پر ہوتی ہے۔

سوسیلا ایک توہوں ہی دائم الریض تھی۔ اُس پر اُسے دن کی کوفت اور جلن نے اُسے اور بھی گھلا ڈالا۔ بیٹی کی فکر سوبان روح ہو گئی۔ شکایتوں نے کلیجہ چھلنی کر دیا۔ چھ مہینہ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ تپ دق کے آثار نمودار ہو گئے۔ پہلے تو مہینہ عشرہ تک طبیعت پر زور ڈالکر اپنا آزار دل چھپاتی رہی۔ مگر آخر کب تک؟ مرض بڑھنے لگا۔ اور طاقت نے جو ابیدیا۔ قیدی بستر ہو گئی۔ حکیم اور ڈاکٹر علاج کرنے لگے۔ تین چار مہینہ میں حالت ایسی نازک ہو گئی کہ معالجوں نے بھی علاج سے ہاتھ اٹھا لیا۔ برجن اور سُباما دونوں شب و روز اُس کے پاس بیٹھی رہتیں۔ برجن ایک لمحہ کو بھی اُسکی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پاتی۔ اُسے اپنے پاس نہ دیکھ کر سوسیلا بدحواس سی ہو جاتی۔ اور چیخ و پونج کر رونے لگتی۔ فنی سمیون لال پہلے تو سرگرمی سے علاج کرتے رہے۔ مگر جب دیکھا کہ کسی دوا سے فائدہ نہیں ہوتا۔ اور مریضہ کی حالت روز بروز اہتر ہوتی جاتی ہے تو آخر انھوں نے بھی مایوس ہو کر امت چھوڑ دی۔ آج سے کئی سال پہلے جب سُباما بیمار ہوئی تھی۔ اس وقت سوسیلا نے اُسکی تیمارداری میں بڑی ہافتقانی کی تھی۔ اب سُباما کی باری آئی۔ اور اُسے ہمسائیگی اور ہنسنا پے کا حق پوری طرح ادا کر دیا۔ تیمارداری میں اپنے گھر کا کام کاج بھول گئی۔ دو دو تین تین دن تک پرتاپ سے بولنے کی لذت نہ آتی۔ اکثر وہ بے کھانا کھائے ہی مرے چلا جاتا۔ مگر کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتا۔ سوسیلا کی حالت نے اب اُسکی آتش حسد کو بہت مدھم کر دیا تھا۔ حسد کی آگ محمود کی ترقی اور بہتری کے ساتھ تیز اور شعل ہوتی جاتی ہے۔ اور اُسی وقت بجھتی ہے جب محمود کی زندگی کا چراغ بجھ جاتا ہے۔ جس دن برج رانی کو معلوم ہو جاتا۔ کہ آج پرتاپ بلا کھانا کھائے مدھم چلا رہا ہے۔

آس دن وہ شب کام چھوڑ کر اُسکے گھر دوڑی جاتی۔ اور کھانے کے لئے ضد کرتی مگر پرتاپ اُس سے بات تک نہ کرتا۔ اُسے روتے چھوڑ کر باہر چلا جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ برجہن کو بالکل بیخفا سمجھتا تھا۔ مگر ایک ایسے رفتے کو جو برس چھ مہینہ میں متعلق ہو نیوالا ہو وہ پہلے ہی سے توڑ دینا چاہتا تھا۔ تنائی میں بیٹھ کر وہ آپ ہی آپ گھٹول پھوٹ پھوٹ روتا۔ مگر ضبط کا مادہ اُسکے دل میں کچھ ایسا مضبوط تھا کہ وہ اپنے جوشِ محبت کو قابو سے باہر نہ دیتا۔

ایک روز وہ مدرسے سے آکر اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ برجہن آئی۔ اُسکے رخسار پہ آنسو سے تر تھے۔ اور لمبی لمبی سسکیاں لے رہی تھی۔ اُسکے چہرہ پر رقت کچھ ایسی حسرت اور بے بسی چھائی ہوئی تھی۔ اور نگاہیں کچھ ایسی التجا آمیز تھیں کہ پرتاپ سے ضبط نہ ہو سکا۔ اُبدیدہ ہو کر لولا کیوں برجہن؟ رو کیوں رہی ہو؟ برجہن نے کچھ جواب نہ دیا۔ بلکہ اور بلک بلک رونے لگی۔ پرتاپ کا ضبط رخصت ہو گیا۔ وہ بیتاب ہو کر اُٹھا اور برجہن کے آنکھوں سے آنسو پوچھنے لگا۔ برجہن نے آواز سنبھال کر کہا اللہ اب اماں نہ جیئ گی۔ میں کیا کروں؟ یہ کہتے کہتے وہ پھر سسکیاں بھرنے لگی۔

پرتاپ یہ خبر سن کر سناٹے میں آ گیا۔ بدحواس دوڑا ہوا برجہن کے گھر گیا۔ اور سوسیلہ کی چار پائی کے پاس کھڑا ہو کر رونے لگا۔ ہمارا آخری وقت کیسا مبارک ہوتا ہے۔ وہ ہمارے پاس ایسے ایسے پر خوکھو کھینچ لاتا ہے جو چند دن پہلے ہماری صورت سے بیزار تھا جو جنھیں سوار اُس طاقت کے دنیا کی کوئی دوسری طاقت زیر نہ کر سکتی تھی۔ ہاں یہ وقت ایسا ہی طاقتور ہے۔ وہ بڑے بڑے سرکش دشمنوں کو ہمارا مطیع کر دیتا ہے۔ جنہر ہم کبھی فتح نہ پاسکتے تھے انہر یہ وقت ہمارے ہاتھ میں آتا ہے۔

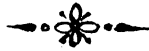
جنہر ہم کسی اتھارے غالب نہ اُسکتے تھے انہر یہ وقت باوجود قوی کے معنمل ہو جانے کے ہکو غالب کر دیتا ہے مکن پرے سال بھر کے بعد پتاپ نے اس گھر میں قدم رکھا۔ پہلا کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر چہرہ ایسا شگفتہ تھا جیسے صبح کے وقت کا کنول۔ آج صبح ہی سے وہ رٹ لگائے ہوئے تھی کہ لکڑی کو کچا دو۔ سببا مانے اسی لئے برجن کو بھجوا تھا۔

سببا مانے کہا بہن آنکھیں کھولو۔ لکڑی کھڑا ہے۔

سوسیلانے آنکھیں کھول دیں۔ اور اپنے دونوں بازو فرط محبت سے پھیلا دیئے۔ پتاپ کے دل سے کینہ کا آخری نشان بھی محو ہو گیا۔ اگر ایسے وقت میں بھی کوئی انسان دل میں کینہ کا غبار رہنے سے تو وہ انسان کھلانے کا مستحق نہیں ہے۔ پتاپ سچے فرزندانه پیش سے اگے بڑھا۔ اور سوسیلانے کے آغوش محبت میں جا پڑا اور دو قتل آدھ گھنٹہ تک دوتے رہے۔ سوسیلانے دونوں بازوؤں سے ایسا دبائے ہوئی تھی گویا وہ کہیں بھاگا جا رہا ہے۔ وہ اس وقت اپنے تئیں صدمہ ملا متیں کر رہا تھا۔ میں ہی اس دکھیا کا جان لیوا ہوں۔ میں ہی حمد کے کینہ جذبہ سے مغلوب ہو کر اسے اس ذہبت کو پہنچایا ہے۔ میں ہی اس پریم کی ہوت کا قاتل ہوں۔ جوں جوں یہ خیالات اُسکے دل میں آتے۔ اُسکے آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔ آخر سوسیلانے اپنی لٹو امیں دو ایک دن کی اور ممان ہوں میرا تو کچھ کمانا ہو وہ معاف کر دو۔ پتاپ کی آواز قابو میں دھتی۔ کچھ جواب نہ دیا۔

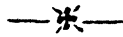
سوسیلانے پھر بولی ”د جانے کیوں تم مجھ سے ناامض ہو۔ تم ہمارے گھر نہیں آتے۔ ہم سے باتیں نہیں کرتے۔ جی تمہیں پیار کرنے کو ترس دس کے رہ جاتا ہے۔ مگر تم میری ذمہ بھی خبر نہیں لیتے۔ بتاؤ۔ اپنی غریبہ سبب جی سے کہیں روٹھے ہو۔ ایسا تو جانا ہے میں تمہیں میرا اپنا لڑکا سمجھتی رہی۔ تمہیں دیکھ کر میری محبت پھول اُٹھتی تھی۔

یہ کہتے کہتے نقاہت کے باعث اُسکی آواز بہت دھیمی ہو گئی۔ جیسے اُفتی کے
 اتھاہ وسعت میں اُڑنیوالی مرغابی کی آواز ہر لمحہ مدھم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اُسکی آواز
 کا مرنے خیال باقی رہ جاتا ہے۔ اُسی طرح سوسیلا کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے مرنے لگتی
 رہ گئی۔



گیارھویں فصل

سوسیلا کی وفات



تین دن اور گزرے۔ سوسیلا کے جینے کی اب کوئی اُس باقی نہ رہی تھی۔ تینوں دن
 منشی سیمون لال اُسکے پاس بیٹھے اُسکی تشفی کرتے رہے۔ وہ ذرا دور کے لئے بھی کسی کام سے
 چلے جاتے تو وہ بیقرار ہونے لگتی۔ اور رو رو کر کہتی کہ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ اُگلا آنکھوں
 کے سامنے دیکر بھی اُسے تسکین نہ ہوتی۔ رہ رہ کر ایک مجنونادہ جوش سے اُنکا ہاتھ پکڑ لیتی۔
 اور پاپو سناں لہجہ میں کہتی مجھے چھوڑ کر کہیں چلے تو زباؤں گئے۔ منشی جی کو استقلال کے آدمی تھے۔
 مگر ایسی باتیں سنکر ابدیدہ ہو جاتے۔ ذرا ذرا دیر میں سوسیلا پر ایک غشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔
 پھر چونکتی تو اُدھر اُدھر وحشت آمیز نگاہیں ڈال کر پوچھنے لگتی۔ وہ کہاں گئے؟ کیا چھوڑ کر چلے گئے۔
 بعض اوقات تسیان کا اتنا غلبہ ہو جاتا کہ منشی جی بار بار کہتے میں بیٹھا ہوں۔ گھبراؤ نہیں مگر
 اُسے یقین نہ آتا۔ انھیں کی طرف تکتی اور پوچھتی کہاں ہیں۔ یہاں تو نہیں ہیں۔ کہاں چلے گئے

ذرا دیر میں جب ہوش آجاتا تو خاموش ہو جاتی۔ اور رونے لگتی۔ تینوں دن اُسے
 برجن۔ سباما۔ پرتاپ ان تینوں میں سے ایک کی بھی یاد نہ کی وہ سب کے سب
 ہر دم اُسکے پاس کھڑے رہتے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا کہ وہ بجز منشی جی کے اور کسی کو پہچانتی
 ہی نہیں۔ جب برجن بہت بیقرار ہو جاتی۔ اور اُسکے گلے میں ہاتھ ڈال کر رونے لگتی
 تو وہ ذرا آنکھیں کھول دیتی اور پوچھتی کون ہے برجن؟ ہوں۔ بس اور کچھ نہ پوچھتی۔ جیسے
 بخیل کے دل میں مرنے کے وقت سوائے اپنے دھینے کے اور کسی بات کا دھیان
 نہیں رہتا۔ اُسی طرح ہندو عورت اپنے آخری لمحوں میں سوائے اپنے بچے کے اور کسی کا
 دھیان نہیں کر سکتی۔ کیونکہ بخیل کو اپنی دولت سے جتنی محبت ہے اُس سے بہت زیادہ۔
 بدرجہا محبت بچی برتاوحت کو اپنے شوہر سے ہوتی ہے۔

کبھی کبھی سوسیلہ یکایک چونک پڑتی اور ہک بکا کر پوچھتی ارے یہ کون کھڑا ہے۔
 یہ کون بھاگ جا رہا ہے۔ انھیں کیوں لے جاتا ہے۔ نہ۔ میں نہ جانے دوں گی۔ یہ لکڑ
 منشی جی کے ہودوں ہاتھ زور سے پکڑ لیتی۔ ایک لمحہ میں جب ذرا بخودی دور ہوتی تب نہر کر
 کتہ میں سپنا دیکھ رہی تھی۔ جیسے کوئی تمھیں لے جاتا تھا۔ دیکھو تمھیں ہماری قسم۔ جانا نہیں
 نہیں معلوم کہاں لیجا بیگا۔ پھر تمھیں کیسے دیکھو گی۔ ایس! منشی جی کا کلیجہ سونے لگتا۔
 اُسکی طرف نہایت محبت آمیز شفقت اور دروسے بھری ہوئی نگاہ ڈال کر دلتے نہیں۔
 میں نہ جاؤں گا۔ تمھیں چھوڑ کر کہاں جاؤں گا۔ سباما اُسکی حالت دیکھتی اور روتی کہ اب یہ
 کچھ دیر کی اور صمان ہیں۔ غمزدہ نے اُسکی ٹھمر دھیان سب دور کر دی تھی۔ منشی جی کے
 سامنے گھنٹوں بے حجاب کھڑی رہتی۔

چوتھے دن سوسیلہ کی حالت سنبھل گئی۔ منشی جی کو یقین ہو گیا کہ بس یہ آخری فیصلہ

چراغ نکل ہونے سے پہلے بجھک اٹھتا ہے۔ سویرے ہی جب ہاتھ منہ دھو کر گھریں
آئے تو سویلا نے انھیں اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ اور بولی کہ مجھے اپنے ہاتھ
سے تھوڑا سا پانی پلا دو۔ آج اسپرئسیان کا غلبہ بہت کم معلوم ہوتا تھا۔ اسے برجن -
سُبا ما۔ پر تپ سب کو بخوبی پہچانا۔ اور برجن کو بڑی دیر تک چھاتی سے لگائے روتی ہی۔
جب پانی پی چکی تو سُبا ماسے کہا بہن ذرا کھوٹا کھٹکٹھا دو۔ سوامی جی کے پیر پھولوں پھر
نہ جانے کب ان چہرہ لڑوں کے درشن ہو گئے۔ سُبا مانے روتے ہوئے اسے ہاتھوں کے
سہارے ذرا سا اٹھا دیا۔ پر تپ اور برجن سامنے کھڑے تھے۔ سویلا نے منشی جی سے
کہا فرار نزدیک آجاؤ۔ منشی جی اس وقت فرط محبت و درد سے بخود ہر کر اُسکے سینہ سے لپٹ گئے
اور روتے ہوئے بولے تم گھبراؤ نہیں۔ الٹو چاہے گا تو تم اچھی ہو جاؤ گی۔ سویلا نے
ما یوسانہ انداز سے مسکرا کر کہا ہاں آج اچھی ہو جاؤ گی۔ ذرا اپنا پیر بڑھا دو۔ میں چوم لوں۔
منشی جی ہچکچاتے رہے۔ اس وقت سُبا ما پہلی بار اُسے روتے ہوئے بولی۔ پیر بڑھا دیجئے۔
ایکے دل کی آرزو بھی نکل جائے۔ تب منشی جی نے پیر بڑھا دیا۔ سویلا نے اُسے دو توں
ہاتھوں سے پکڑ کر کئی بار چوما۔ اور تب اپنا ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔ اور دم کی دم میں دونوں
پیر گرم قطروں سے تر ہو گئے۔ پتی برتا عورت نے پریم کے موتی شوہر کے قدموں پر
نثار کر دیئے۔

جب ذرا آواز قابو میں ہوئی تو اُس نے برجن کا ایک ہاتھ پکڑ منشی جی کے ہاتھ میں دیا۔
اور نہایت دھیمی کوازیں بولی۔ سوامی جی۔ آپ کے ساتھ بہت دن رہی۔ اور زندگی کا
بہت ٹکڑا کھایا۔ اب پریم کا ناتا ٹوٹا ہے۔ اب میں دم بھر کی اور مہمان ہوں پیاری
برجن کو تمھیں سوچنے جانی ہوں۔ میری ہی نشانی ہے۔ اسپر ہمیشہ مہربانی کی نگاہ رکھتا

میری قسمت میں اپنی پیاری بچی کا سکھ دیکھنا نہ لکھا تھا۔ اُسے مٹنے کبھی کوئی کڑی بات نہیں کہی۔ کبھی کڑی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ یہ میری زندگی کا پہل ہے۔ ایشور کے لئے تم اُسکی طرف سے بے سُدھ نہو جانا۔ یہ کہتے کہتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ ادغشی سی آگئی۔

جب ذرا پھر افاقہ ہوا تو اُس نے سُبھا ما کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے اور رو کر بولی

”بھن بھن بھن ہمارے سپرد ہے۔ تم اُسکی ماں کی جگہ ہو۔ لکھو! پیارے۔ ایشور کرے تم جگہ جگہ جیو۔ اپنی برجن کو بھولنا مت۔ وہ تمہاری غریب بے ماں کی بہن ہے۔ تم میں اُسکی جان لبتی ہے۔ اُسے رولانا مت۔ اُسے کڑھا نا مت۔ اُسے کبھی کڑی بات مت کہنا۔ اُس سے کبھی نہ رو دھنا۔ اُسکی طرف سے پیار نہو نا۔ نہیں تو وہ رو کر جان دیدگی۔ اُسکے بھاگ میں نہ جانے کیا بد ہے۔ مگر تم اُسے اپنی سگی بہن سمجھ کر سدا اُسکی دلجوئی کرتے رہنا۔ میں خدادیر میں تم لوگوں کو چھوڑ کر چلی جاؤنگی۔ مگر تمہیں میری قسم۔ اُسکی طرف سے من ہونا مکرنا۔ تم نے اور تمہاری ماں نے اُسے آدمی بنایا ہے اور تمہیں اُسکا بیڑا پار لگاؤ گے۔ میرے دل میں بڑے بڑے ارمان تھے۔ میری لالسا تھی کہ تمہارا یہ یاد کر ڈنگی۔ تمہارے بچے کھلاؤنگی۔ مگر بھاگ میں کچھ اور ہی بلا تھا“

یہ کہتے کہتے پھر بیہوشی اور نقاہت نے اُس پر فلبہ کیا۔ سارا گھر رو رہا تھا۔ مہریاں۔

مہراجنیں۔ نوکر چاکر سب اُسکا جس کارہے تھے۔ عورت نہیں دیوی تھی۔

روحیہ! اتنے دن شل کرتے ہوئے مگر کبھی کڑی بات نہیں کہی“

مہراجن نے ٹھیکوٹی کی طرح مانتی تھیں۔ کھانا کیسا ہی پچا کے رکھ دوں۔ مگر کبھی نہ نہیں

ہوئیں۔ جب بات کرتیں مسکرا کے۔ مہراج جب آتے تو انہیں جبرور سیدھا دلاتی تھیں“

اسی طرح کی باتیں سب کر رہے تھے۔ دوپہر کا وقت آیا۔ مہراجن نے کھانا بنایا مگر

کھا تا کون۔ منشی جی بڑے امرار سے گئے اور منہ جھوٹا کر کے چلے آئے پرتاپ نے وہاں
 ٹپکنے کی قسم کھالی تھی۔ بچن اور سببا کو بھوک کہاں۔ سوسیلا کبھی بچن کو پیار کرتی کبھی
 سببا کو گلے لگاتی۔ کبھی پرتاپ کو چومتی اور کبھی اپنی بیٹی کہہ کہہ کے روتی۔ سہ پہر کو وقت
 اُسے سب نوکر و نگو بلوایا۔ اور اُسے خطا معاف کروائی۔ جب یہ سب چلے گئے تو سوسیلا
 سببا سے بولی بہن پیاس بہت لگتی ہے۔ اُسے کہہ دو ذرا اپنے ہاتھ سے پھر پانی پلاؤ۔
 منشی جی پانی لائے اور سوسیلا نے ایک گھونٹ بہ مشکل تمام حلق کے نیچے اتارا۔ اور
 ایسا معلوم ہوا گویا اُسے کسی نے امرت پلا دیا۔ اسکا چہرہ روشن ہو گیا۔ آنکھوں میں
 رس بھر آیا۔ شوہر کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بولی ”میں کیسی بھاگو ان ہوں کہ تمہارے
 گود میں مرتی ہوں“ یہ مکروہ چپ ہو گئی۔ جیسے کوئی بات کہنی چاہتی ہے۔ اور لحاظ
 سے نہیں کہتی۔ تھوٹی دیر کے بعد اسنے پھر منشی جی کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی ”اگر تم سے
 کچھ مانگوں تو دو گے؟“

منشی جی نے متعجب ہو کر کہا ”تمہارے لئے مانگنے کی ضرورت ہے؟ شوق سے کہو۔“
 سوسیلا ”تم میری بات کبھی نہیں مانتے تھے۔“
 منشی جی ”مرنے دم تک کبھی نہ مانوں گا۔“
 سوسیلا ”ڈر لگتا ہے۔ کہیں نہ مانو تو۔۔۔۔“
 منشی جی ”تمہاری بات اور میں دمانوں۔“
 سوسیلا ”میں تم کو نہ چھوڑ دوں گی۔ ایک بات بتلا دو۔ سلی مر جائیگی تو اُسے بھول جاؤ گے؟“
 منشی جی ”ایسی باتیں نہ کرو۔ دیکھو بچن روتی ہے۔“
 سوسیلا ”بتلا دو مجھے بھولو گے تو نہیں۔“

منشی جی ”تمہاری یاد مرتے دم تک تازہ رہیگی۔“

سویلا نے اپنے مڑجھائے رخسارے منشی جی کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ اور
دولوں بائیں اُنکے گلے میں ڈال دیں۔ پھر برجن کو قریب بلا کے آہستہ آہستہ بچانے
لگی دیکھو بیٹا۔ لالہ جی کا کہنا ہر دم ماننا۔ اُنکی سیدنا خوب من لگا کر کرنا۔ گھر کا سارا بوجھ اب
تمہارے ہی اوپر ہے۔ اب تمہارے سوا کون پنہا لے گا۔“

یہ ککر اُسے شوہر کی طرف دروازے پر نکلا ہوں سے دیکھ کر کہا۔ ”میں اپنے من کی
بات نہیں کہنے پائی۔ جی ڈوبا جاتا ہے۔“

منشی جی ”تم ناحق پس و پیش کرتی ہو۔“

سویلا ”تم میرے ہو کہ نہیں۔“

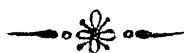
منشی جی ”تمہارا اور مرتے دم تک تمہارا۔“

سویلا ”ایسا نوک مجھے بھونچاؤ۔ اور جو چیز میری تھی وہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں چلی جائے۔“
منشی جی (اشارہ سمجھا کر) ”اسکا ذکر ہی کیوں کرتی ہو۔ جب تک کہ جیتو نکا تمہارا ہی رہو گا۔“

سویلا نے برجن کو پھر بلایا اور باپ کے قدموں پر گرادیا۔ اور مارے صغف کے
بیدم ہو گئی۔ برجن اور پر تاپ رونے لگے۔ سُبامانے بھی سمجھا کر ٹٹماتا ہوا چلنے لگا۔
منشی جی نے کانپتے ہوئے سویلا کے سینہ پر ہاتھ رکھا۔ سانس دھیرے دھیرے
چل رہی تھی۔ مہراجن کو بل کر کہا اب انھیں زمین پر ٹا دو۔ یہ کہتے ہوئے بے اختیار
رونے لگے۔ مہراجن اور سُبامانے ملکر سویلا کو زمین پر تار دیا۔ تپ دق نے ہڈیاں تک
سکھا ڈالی تھیں۔

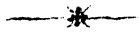
اندھیرا ہو چلا تھا۔ سارے کمرہ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ حیرت ناک سناٹا۔ خوش ناک سناٹا۔

وہ سناٹا جو دل کو ٹھونک رہا تھا اور شکر بنا دیتا ہے۔ رویو اے روتے تھے۔ مگر گلا دبا دیا۔
 باتیں ہوتی تھیں۔ گردنی آوازوں میں۔ سوسیلہ زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ تن نازک جو
 کبھی ماں کے گود میں پلا۔ کبھی محبت کے آغوش میں لیٹا۔ کبھی پھولوں کے سچ پر سوا ارقم
 زمین پر پڑا ہوا تھا۔ ابھی تک بعض آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ منشی جی فرط الم وایں
 سے خاموش اس کے سر ہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ دفعتاً سوسیلہ کے اعضا میں حرکت
 پیدا ہوئی۔ اُسے سر اٹھا دیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے منشی جی کا پیر کپڑا لیا۔ اور سو ہر دواز
 کر گئی۔ دونوں ہاتھ اُنکے پیروں کا حلقہ کئے ہی رہ گئے۔ یہ زندگی کا آخری کام تھا۔
 رویو والو! روؤ کیونکہ سوا اے رونے کے اور تم کراہی کیا سکتے ہو۔ تمہیں اس وقت
 کوئی کتنا ہی سمجھائے۔ مگر تمہاری آنکھیں اُنسو کی باڑھ کو نہ روک سکیں گی۔ رونا تمہارا فرض
 ہے۔ زندگی میں رونے کے موقعے شاد ہی ملتے ہیں۔ کیا اس موقع پر تمہاری آنکھیں
 بخل کر جائیں گی۔ آنسوؤں کے تار بندھے ہوئے تھے۔ سسکیوں کی آوازیں آہی تھیں
 کہ مہرجن چراغ جلا کر کرہ میں لائی۔ ذرا دیر پہلے سوسیلہ کی زندگی کا چہرہ ان
 بجھ چکا تھا۔



بارھویں فصل

برجن کی رخصتی



رادھا چرن گڑ کی کالج سے نکلنے ہی مراد آباد کے انجینیئر مقرر ہو گئے۔ اور چند اُنکے ساتھ مراد آباد کو چلی۔ پریمیوتی نے بہت روکنا چاہا۔ مگر جانے والے کو کون روک سکتا ہے۔ سیوتی کب کی سسرال جا چکی تھی۔ یہاں گھر میں اکیلی پریمیوتی رہ گئی۔ اُسکے سرگھر کا کام کاج۔ آخر یہہ راے ہوئی کہ برجن کی رخصتی کا پیغام دیا جائے۔ ٹیڑھی جٹا رخصتی کے سخت برخلاف تھے۔ مگر گھر کے معاملات میں پریمیوتی کا حکم قطعی ہوتا تھا۔

سچیمون لال نے پیغام منظور کر لیا۔ کچھ دنوں سے وہ تیرھہ جاڑا کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سوسیلہ کے مرنے کے بعد رفتہ رفتہ انھوں نے تمام دنیاوی تعلقات ترک کر دیے تھے۔ دن بھر کمرہ میں آسن مارے بھگوت گیتا اور یوگ شسٹ اور دوسری معرفت کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے۔ شام ہوتے ہی گنگا استنان کو چلے جاتے۔ وہاں سے رات گئے لوٹے۔ اور دو چار لقمے کھا کر سو جاتے۔ اکثر پرتاپ چندر بھی اُنکے ساتھ گنگا استنان کو جاتا۔ اور اگرچہ پورے سو اہ سال کا بھی نہوا تھا مگر بہت فطری کہو۔ یاورثہ پدری۔ یا فیض صحبت کہ ابھی سے اُسے اسرار معرفت پر غور و خوض کرنے میں حید لطف حاصل ہوتا۔ گیان اور حقیقت کے تذکرے سنتے سنتے اُسکا رُحان بھی بھگتی کی جانب ہو چلا تھا۔ اور بعض اوقات منشی جی سے ایسے دقیق مسائل پر

بحث کرتا کہ وہ حیرت میں آجاتے۔

برج رانی پر سببا کی تعلیم کا اُس سے بھی گہرا اثر پڑا تھا جتنا پرتاپ چندر پر منشی جی کی صحبت اور تعلیم کا۔ اُسکا چندر حلوں سال تھا جو ہمارے یہاں شباب کی پہلی منزل سمجھی جاتی ہے۔ اُس سن میں لڑکیوں پر شوق سنگار کا جنون سوار ہوتا ہے۔ اُنکے انداز اور طریق میں بجائے طفلانہ شوخی کے ایک متانت آمیز جلیلا پن پیدا ہو جاتا۔ دلوں میں شباب کی انگلیں لہریں مارنے لگتی ہیں۔ اور نکاحوں سے بجائے سادگی اور شوخی کے ایک جذبات آمیز رسیلا پن برسنے لگتا ہے۔ مگر برج رانی ابھی تک وہی بھولی بھالی لڑکی تھی۔ اُسکا چہرہ معصومیت کی تصویر تھا۔ ایک ایک انداز سے سادگی چمکتی تھی۔ ہاں رفتار میں ایک دلاویز دھیراپن اور طرز کلام میں لُجائیوالی شیرینی پیدا ہو گئی تھی۔ اُسکی باتیں سننے والے پر مہمئی منتر پڑھ دیتی تھیں۔ مہنڈ اندھیرے اُٹھتی۔ اور سب سے پہلے منشی جی کا کمرہ صاف کر کے اُنکے پوجا پاٹ کا سامان قرینہ سے رکھ دیتی۔ پھر روبرو کے دھندے میں لگ جاتی۔ دوپہر کا وقت اُسکے لکھنے پڑھنے کا تھا۔ سببا سے اُسے جتنی محبت اور عقیدت تھی اتنی شاید اپنی ماں سے بھی نہ رہی ہو۔ اُسکی مرضی برجن کے لئے قانون تھی۔

سببا کی تو صلاح تھی کہ ابھی رخصتی نہ کی جائے۔ مگر منشی جی مصر ہوئے اور بڑائی کی تہاہریاں ہونے لگیں۔ بچوں جوں وہ مصیبت کی گھڑی سر پر آتی۔ برجن کی بیکاری بڑھتی جاتی تھی۔ رات دن رویا کرتی۔ کبھی باپ کے پیروں پڑتی۔ کبھی سببا کے پیروں سے لپٹ جاتی۔ مگر یہاں ہی لڑکی پر اسے گھر کی ہو جاتی ہے۔ اسپر کسی کا کیا پرتاپ چند اور برجن کتنے دنوں تک بھائی بہنوں کی طرح ایک

مگر اب برجہن کی آنکھیں اُسے دیکھتے ہی نیچے کو جھک جاتیں۔ پرتاپ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ گھر میں بہت کم آتا۔ یا کسی ضرورت سے آتا تو کچھ اسطرح نکلاہیں نیچے کئے۔ اور مٹا ہوا گویا دوا لہن ہے۔ اُسکی ان نگاہوں میں وہ راز محبت چھپا ہوا تھا جسے وہ کسی متنفس نہ تھی کہ برجہن پر بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک روز شام کا وقت تھا۔ رخصتی کو مرتین دن۔ رہ گئے تھے۔ پرتاپ کی ضرورت سے اندر گیا اور اپنے کمرہ میں لمپ جلانے لگا کہ برجہن آئی۔ اُسکا اچھل آنسوؤں سے تر تھا۔ اُسنے آج دو برس کے بعد پرتاپ کی طرف پُراں آنکھوں سے دیکھ کر کہا ”الو مجھ سے کیسے مبر ہو گا!“

پرتاپ نے مروان ضبط سے کام لیا۔ اُسکی آنکھوں میں آنسو نہ آئے۔ اُسکی آواز بھاری نہ تھی۔ واعظانہ لہجہ میں بولا۔ ”ایشور تمہیں صبر کی طاقت دے گا۔“

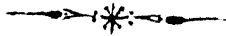
برجہن کی گردن جھک گئی۔ آنکھیں زمین میں گڑ گئیں۔ اور ایک دہی ہوئی سسکی نے حسرت و درد کا وہ دفتر بیان کر دیا جو زبان سے ناممکن تھا۔

رخصتی کا دن لڑکیوں کے لئے عجیب حسرت کا دن ہوتا ہے۔ بچپن کی سکھیاں۔ سہلیاں۔ ماں باپ۔ بھائی بند۔ گھر کے مانوس درو دیوار ان سب سے نانا لوٹ جاتا ہے۔ یہ خیال کہ میں پھر اس گھر میں آؤں گی اُسے مطلق تسکین نہیں دیتا۔ کیونکہ اب وہ آئیگی تو مہمان کی حیثیت سے آئیگی۔ اُن لوگوں سے جدا ہونا جنکے درمیان زندگی کے گہوارے میں کھیلنا اور بیٹھکریوں کے جہن میں سیر کرنا نصیب ہوا ہوا سکے جگر کے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ اب تک وہ دنیا کے اور پابندیوں سے آزاد رہتی ہے۔ مگر آج سے اسکے سر پر ایسا بوجھ لدا ہے جو مرنے

’نا پڑیگا‘

برجن کا سنگار کیا جا رہا تھا۔ نائن اُسکے پیروں میں مہاور چاہی تھی۔ کوئی اُسکے سر کے بال گوندھ رہی تھی۔ کوئی جوڑے میں عطر بامہی تھی۔ مگر جبکے لئے یہ سب تیاریاں ہو رہی تھیں وہ زمین پر موتی کے دانے یوں کچھیر رہی تھی گویا اُنکا کچھ میل نہیں ہے۔ اتنے میں باہر سے پیغام آیا ساعت ٹلی جا رہی ہے۔ جلدی کرو سُباما پاس کھڑی تھی۔ برجن اُسکے گلے لپٹ گئی۔ اور وہ ہوش گرہ جو اب تک دہی ہوئی آگ کی طرح مُسک رہا تھا یکبارگی یوں ابل پڑا جیسے کوئی آنچ میں تیل ڈال دے۔

فرادیر میں پالکی دروازہ پر آئی۔ برجن پاس پڑوس کی عورتوں سے گلے ملی۔ سُباما کے پیر چھوئے۔ اور تب دو تین عورتوں نے اُسے پالکی کے اندر بٹھا دیا۔ ادھر پالکی اُٹھی۔ ادھر سُباما غش کھا کر زمین پر گر پڑی۔ گویا اُسکے جیتے جی کوئی اُسکی جان نکال کر لئے جاتا تھا گھر سونا ہو گیا۔ سیکڑوں عورتوں کا جھگھٹ تھا۔ مگر ایک برجن کے نہونے سے مکان بھاڑے کھاتا تھا۔



تیرھویں فصل

کملہ چرن کے دوست

— ❦ —

جیسے سیندر کی سُرخ سی ماگ سج جاتی ہے اُسی طرح برج رانی کے آنے سے پریمیوتی کے گھر کی رودنی دو بالا ہو گئی۔ سب بامانے اُسے ایسے گُن سکھائے تھے کہ جسے اُسے دیکھا موہ گیا۔ یہاں تک کہ سیوتی کی سیلی رانی کو بھی پریمیوتی کے سامنے اقرار کرنا پڑا کہ مہماسی چھوٹی بہو نے تو ہم سبھوں کا رنگ پھیکا کر دیا۔ سیوتی اُس سے دن دن بھر باتیں کرتی اور اُس کا جی نہ بھرتا۔ اُسے اپنے گانے پرنواز تھا۔ مگر اس میدان میں بھی چرن بازی لگینی۔

اب کملہ چرن کے دوستوں نے تقاضا کرنا شروع کیا کہ بھیجی نئی دولہن گھر میں لاکو۔ کچھ دعوت جلسہ کی بھی فکر ہے۔ سنتے ہیں نہایت حسین بچی پائی ہے۔ کملہ چرن کو دہرے تو سسرال میں ملا ہی تھا۔ جیب کھٹکھٹا کر لوے اجی دعوت لو۔ شرابیں اڑاؤ۔ اکلیں سنکو۔ ل بہت ہو حق نہ مچانا۔ ورنہ کہیں اندر نہ ہو تو سمجھیں یہ شہدا ہے۔ جب سے وہ گھر میں آتی ہیں انجاناب کا قافیہ تنگ ہے۔ سنتا ہوں انگریزی۔ فارسی۔ سنسکرت آلم فلم سب گھوٹ بیٹھی ہوئی ہے۔ ڈرتا ہوں کہیں انگریزی میں پوچھ بیٹھی تو۔ یا فارسی میں بات چیت شروع کر دی تو۔ سوائے غلیں مچانکنے کے اور کیا کروں گا۔ اسلئے ابھی کئی کاٹا پھرتا ہوں یا یوں تو کملہ چرن کے دوستوں کی تعداد لامحدود تھی۔ شہر کے جتنے کبوتر باز۔

کنکڑے باز۔ شہدے تھے سب انکے دوست تھے مگر دلی دوستوں میں مرنے والے کو مرنے والے کا کچھ سب فاقہ مست۔ آوارہ۔ انہیں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ میاں مجید تھے۔ کپڑی میں عرائض نویسی کیا کرتے تھے۔ جو کچھ ملاوہ سب شراب کے نذر کرتے۔ دوسرا بزم چیل کا تھا۔ ان ذات شریف نے ورثہ میں بڑی دولت پائی تھی۔ مگر تیس سالوں میں سب کچھ ارباب نشاط کے نذر کر دیا۔ بید و تیرہ تھا کہ شام کو سچ و جھج بنا کر گلیوں کی خاک چھاتے پھرتے۔ اور وقت ضرورت پر بازار حسن کی دلالی بھی کیا کرتے تھے۔ اس بازار کے خریدار اور بیوپاریوں میں انکی بڑی رسائی تھی۔ تیسرے حضرت سعید حسین تھے۔ ایک ہی شغل تھا بازار۔ سینکڑوں کے والوں لگانے والے۔ بیوی کے زیوروں پر ہاتھ مسات کرنا روزمرہ کا شغل تھا۔ باقی دو صاحب رام سیوک اور چند دلال کپڑی میں ملازم تھے۔ تنخواہیں تھوڑی۔ مگر بالائی رقم وافر۔ نصف شراب کے نذر کرتے۔ اور نصف شاہان حسن فروش کی خاطر دھارت میں مرنے ہوتی۔ مگر کے لوگ فاقہ کرتے۔ یا بھیک مانگتے۔ انہیں مرنے اپنے حیش سے کام تھا۔

مشورہ تو ہو ہی چکا تھا۔ اٹھ بجے جب ڈپٹی صاحب لیٹے تو یہ پانچوں حضرات جمع ہوئے اور دور چلنے لگا۔ پانچوں پینے میں حاتم تھے۔ دائم الخمر۔ جب ڈرامہ گیتا تو ہنسی ہنسی تھیں ہونے لگیں۔

مجید: ”کیوں بھی کلا چرن! سچ کنا دیکھ کر ہی خوش ہو گیا یا نہیں؟“
 کلا: ”اب آپ بہکنے لگے کیوں؟“

رام سیوک: ”تلا کیوں نہیں دیتے۔ اس میں جھپٹنے کی کیا بات ہے؟“
 کلا: ”تلا کیا اپنا سر دوں۔ کبھی سامنے جانیکا اتفاق بھی تو ہوا ہو کل کو اڑکی دراطے

ایک نظر دیکھ لیا تھا۔ ابھی تک تصویر نگاہوں میں پھر رہی ہے۔“

چند ولال۔ ”میرے یار تو بڑا بلند اقبال ہے۔“

کملہ۔ ”ایسا بقرار ہو اگر کرتے گرتے بچا۔ بس پری سمجھ لو۔“

مجید۔ ”تو بھی یہ دوستی کس دن کام آئے گی۔ ایک نظر میں بھی دکھاؤ۔“

سعید۔ ”بیشک دوستی کے یہی معنی ہیں کہ آپس میں کوئی پردہ نہ رہے۔ دوئی کا مسئلہ ہے لفظ

ہو جائے۔“

چند ولال۔ ”دوستی میں کیا پردہ انگریز کو دکھو۔ پیڑی ڈولی سے اُتری نہیں کیا دوست

ہاتھ ملانے لگے۔“

رام سیوک۔ ”مجھے تو بن دیکھے چین نہ آئیگا۔ ہیں تو پختہ۔“

کملہ۔ ”ایک دھول لگا کر زبان کاٹ لی جائیگی سمجھے۔“

رام سیوک۔ ”کچھ پرواہ نہیں۔ آنکھیں تو دیکھنے کو رہیں گی۔“

مجید۔ ”بھی کلاچن بڑا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ اب اس وقت تمہارا فرض ہے کہ دو تلو

کی فرمائش پوری کرو۔“

کملہ۔ ”ارے تو میں انکار کب کرتا ہوں۔“

چند ولال۔ ”واہ میرے شیر۔ یہ مردوں کی سی باتیں ہیں۔ تو ہلوگ بن ٹھن کر آجائیں کیوں؟“

کملہ۔ ”جی ذرا مت میں کا لکھ لگا لیجیگا۔ بس اتنا کافی ہے۔“

سعید۔ ”تو کار خیر میں تاخیر کیوں ہو۔ آج ہی کی ٹھیری نہ۔“

کملہ۔ ”آج ہی سہی۔ مگر یاد ہے کل آپ سب اصحاب کی بیویوں کو درشن کرونگا۔ اس وقت

اگر کسی نے چیں چپڑ کیا تو بندہ کا پاؤش مبارک ہو گا اور اسکا فرق نامبارک۔“

سب کے سب ”منظور بدل و جان منظور“

رام سیوک ”یہاں کیا دھرا ہے۔ پلج پچوں کی ماں۔ اُس پر پٹے مال غامی پڑی ہو رہی“
چند ولال ”یہاں اُس سے بھی بدتر مال ہے۔ تین مہینے سے چوتھا آ رہا ہے سگر کس دور
نے ایک کڑی کی بھی دوا لی ہو۔ صورت دیکھتے ہی بجا چڑھ آتا ہے“

سعید ”ایجناب یہ روگ ہی نہیں پالتے ہیں۔ چند روزہ ان نظام مستقل نظام سے بہتر نہ ہے“
ادھر قحطے ناب کے دور پل رہے تھے۔ ادھر برجن پلنگ پر لیٹی ہوئی خیالوں
میں غرق تھی۔ بچپن کے دن کیسے اچھے ہوتے ہیں۔ کاش وہ دن پھر آجاتے آہ کبھی مجھ سے
زندگی تھی۔ دنیا ناز۔ پیار اور محبت کا گہوارہ تھی۔ کیا وہ کوئی دوسری دنیا تھی۔ کیا اُن
دنوں دنیا کی خبریں بہت خوبصورت ہوتی تھیں۔ انھیں خیالوں میں آنکھ دیر بھپک گئی۔ اور
بچپن کا ایک واقعہ پیش نظر ہو گیا۔ لٹو نے اُسکی گڑیا مڑوڑ دی۔ اُسنے اُسکی کتاب کے دو
ورق پھاڑ ڈالے۔ تب لٹو نے اُسکی پیٹھ میں زور سے چپکی لی۔ اور بار بار بھاگا۔ وہ رونے لگی
اور لٹو کو کوس رہی تھی کہ سببا اُسکا ہاتھ پکڑے ہوئے آئی اور بولی ”کیوں بیٹی اُسنے
تمھیں مارا ہے نہ۔ یہ بہت مار مار کر بھاگتے ہیں۔ آج انکی حرمت کرتی ہوں۔ دیکھیں کیا
مارا ہے“ لٹو نے ڈبڈبا ئی آنکھوں سے برجن کی طرف دیکھا۔ اور برجن نے مسکرا کر کہا
”مجھے انھوں نے کہاں مارا۔ یہ مجھے کبھی نہیں مارتے“ یہ کہہ کر اُسکا ہاتھ پکڑ لیا۔
اپنے حصہ کی مٹھائی کھلائی۔ اور پھر دونوں ملکر کھیلنے لگے۔ وہ زمانہ اب کہاں؟ اس زمانہ
کی یاد ایک خواب حسرت کی یاد ہے۔

مات زیادہ گزر گئی تھی بچا ایک برجن کو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی سامنے والی دیوارہ حمد
رہا ہے۔ اُسنے کان لگا کر سُنا۔ برابر آوازیں آ رہی تھیں۔ کبھی رُک جاتیں۔ پھر اُسے گھٹین

فرا دیر میں مٹی گرنے لگی۔ خوف کے مارے برجن کے ہاتھ پانوں پھول گئے۔ کلیہ دھک دھک کرنے لگا۔ جی کڑا کر کے اُٹھی۔ اور مہراجن کو بھڑھوٹنے لگی۔ گھگھکی بندھی ہوئی تھی۔ اتنے میں مٹی کا ایک بڑا سا ڈھیلا سامنے گرا۔ اور مہراجن چونکر اُٹھ بیٹھی۔ دونوں کو یقین ہو گیا کہ چور آئے ہیں۔ مہراجن ایک ہی چالاک عورت تھی سمجھی کہ چلاؤنگی تو جاگ ہو جائیگی۔ اُسے سن رکھا تھا کہ چور پہلے سیندر میں پیر ڈال کر دیکھتے ہیں۔ تب خود گھسے ہیں۔ اُسے ایک ڈنڈا اٹھا کر جب پیر ڈالیکا تو ایسا تاک کر مارونگی کہ ٹانگ ٹوٹ جائیگی۔ مگر چور نے پیر کے بجائے سیندر سے سر باہر نکالا۔ مہراجن تاک میں تو تھی ہی۔ ڈنڈا چلا دیا۔ اور کھٹکی کی آواز آئی۔ چور نے فوراً سر کھینچ لیا۔ اور یہ کہتا ہوا سنائی دیا۔ ”اُف! مار ڈالا۔ کھو پڑی بھنا گئی۔“ پھر کئی آدمیوں کے صفے کی آواز آئی۔ اور اسکے بعد سناٹا ہو گیا۔ اتنے میں اور لوگ جاگ پڑے۔ اور باقی رات گپ شپ میں کٹی۔

سویرے جب کھلا چرن گھر میں آئے تو آنکھیں سرخ تھیں۔ اور سر میں آگ لگی تھی۔ مہراجن نے نزدیک جا کر دیکھا اور تب اگر برجن سے بولی ہو ایک بات کہوں۔ ”جراتو نہ مارونگی۔“ برجن۔ ”بُرا کیوں مارونگی۔ کو کیا کہتی ہو؟“

مہراجن۔ ”رات جو سیندر پڑی تھی وہ چوروں نے نہیں لگائی تھی۔“

برجن۔ ”پھر کون تھا؟“

مہراجن۔ ”گھری کے بھیدی تھے۔ باہری کوئی نہیں تھا۔“

برجن۔ ”کیا کسی کمار کی شرارت تھی؟“

مہراجن۔ ”نہیں۔ کماروں میں ایسا کوئی نہیں ہے۔“

برجن۔ ”پھر کون تھا۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں؟“

مہراجنؔ میری جان ^{۹۹}مچھ تو چھوٹے بابو تھے۔ میں نے وہ لکڑی نہیں مچھنی تھی۔
وہ اُنکے سر میں لگی۔ سر پھولا ہوا ہے۔“

اتنا سنتے ہی برجن کے تیور بدل گئے۔ اور پہرہ تنگا گیا۔ غضبناک ہو کر بولی مہراجنؔ
ہوش سنبھا لکرا میں کرو۔ تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ تمہیں میرے سامنے
ایسی بات کہنے کا حوصلہ ہوا؟ خود میرے سر پر الزام ٹھیک رہی ہو۔ تمہارے بڑھاپے
پر ترس آتا ہے۔ ورنہ اسی وقت تمہیں یہاں سے کھڑے کھڑے نکلا دیتی۔ تب تمہیں
معلوم ہوتا کہ زبان کو قابو میں نہ رکھنے کا یہ پھل ہوتا ہے۔ یہاں سے اُٹ جاؤ۔ مجھے
تمہاری صورت دیکھ کر بخار سا چڑھ رہا ہے۔ تمہیں اتنا نہ سمجھ بڑا کہ میں کہی بات زبان سے
نکال رہی ہوں۔ اُنھیں ایشور نے کیا نہیں دیا ہے۔ سارا گھراؤ نکا ہے۔ میرا جو کچھ ہے
اُنکا ہے۔ میں خود اُنکی چیری ہوں۔ اور اُنکی نسبت تم ایسی بات کہہ بیٹھیں۔“

مگر جس بات پر برجن ایسی براہم ہوئی اُسی بات پر گھر کے دوسرے آدمیوں کو آسانی سے
یقین آگیا۔ ڈپٹی صاحب کے کان میں بھی بات پہنچی۔ وہ کلاچرن کو اس سے زیادہ
شریر النفس سمجھتے تھے۔ تینا وہ فی الواقع تھلا خون ہوا کہ کہیں یہ حضرت ہو کے زیور
پر نہ ہاتھ صاف کریں۔ بہتر ہے کہ اُنھیں پور ڈنگ ہاؤس بھیج دیں۔ کلاچرن نے یہ
تجویز سنی تو بہت چپچپے۔ چلائے۔ مگر کچھ سوچ کر دوسرے دن پور ڈنگ ہاؤس چلے گئے
برجن کے آنے سے پہلے کہی بار یہ تجویز ہوئی تھی۔ مگر کلاکی مند کے سامنے ایک بھی
پیش نہ گئی تھی۔ یہ بیوی کے نگاہوں میں ذلیل ہو جانے کا خوف تھا۔ جو ابکی بار اُسے
پور ڈنگ ہاؤس لگیا۔

چودھویں فصل

کایا پیٹ

— ❦ —

پہلا دن تو کلاچرن نے کسی طرح بوڑنگ ہاؤس میں کاٹا صبح سے شام تک پکڑا سو یا کئے۔ دوسرے دن خیال آیا کہ آج تو ثواب صاحب اور تیکھے مرزا کے بیڑوں میں بلا ہوا جوڑ ہے کیسے کیسے مست پٹھے ہیں کہ دیکھ کر روح و جگر کرنے لگے۔ آج انکی پکڑ دیکھنے کے قابل ہوگی۔ شہر کا شہر بھٹ پرے تو عجب نہیں۔ چرخوش۔ شہر کے لوگ تو ہماریں اُٹائیں۔ اور میں یہاں کتابوں سے سرگڑاؤں۔ یہ سوچتے سوچتے اُٹھا۔ اور دم کی دم میں ہان کے موقعہ پر تھا۔

یہاں آج خلقت کی خلقت جمع تھی خاصہ میلہ لگا ہوا تھا۔ سقے چھر کاؤ کر رہے تھے۔ سگرٹ والے کباب والے۔ تہولی سب اپنی اپنی دوکانیں لگائے بیٹھے تھے۔ اور شہر کے رنگین مزاج نوجوان۔ ہاتھوں میں ٹیبلٹ لائے یا عملی اٹوں پر ٹیلوں کو بٹھائے منگرت کر رہے تھے۔ کلاچرن کے دوستوں کی اس جگہ کیا کی لوگ انھیں خالی ہاتھ دیکھتے تو حیرت سے پوچھتے اے راجہ صاحب! آج خالی ہاتھ کیسے۔ اتنے میں میاں سعید۔ مجید۔ حمید وغیرہ نشہ میں چور۔ سگرٹ کے دھوئیں بھکا بھکا اُڑائے نظر آئے۔ کلاچرن کو دیکھتے ہی سب کے سب سر پیٹ دوڑے اور پانچ کے پانچوں عیوب شرعی کی طرح اُن سے لپٹ گئے۔

مجید: ”آج تم کہاں غائب ہو گئے تھے میاں؟ قرآن کی قسم مکان کے سیکڑوں ٹکڑے لگائے ہوئے۔“

رام سیوک: ”آج کل عید کی راتیں ہیں۔ بھئی انکھیں نہیں دیکھتے ہونٹ سا چڑھا ہوا ہے۔“
چند ولال: ”میں کر رہا ہے پٹھا۔ جب سے نازیں گھر میں آئی ہے اس مرد خدا نے بازار کی صورت تک نہیں دیکھی۔ جب دیکھے گھر میں گھسا رہتا ہے۔ خوب چین کرنے یار۔ دوستوں کی طرف سے بھی بو سے لے لیا کر۔“

کملا: ”چین کیا خال کروں۔ یہاں توقید میں پھنس گیا۔ تین دن سے پور ٹنگ میں پڑا ہوا ہوں۔“

مجید: ”ارے! خدا کی قسم!“

کملا: ”تیرے جان کی قسم۔ پرسوں سے مٹی پلید ہو رہی ہے۔ آج سبھوں کی آنکھیں بکا کر نکل بھاگا۔“

رام سیوک: ”اُن! مصیبت سی مصیبت ہے۔ مگر یار خوب اڑے۔ وہ مجھ پر پڑ پڑنا جھلارہا ہوگا۔“

کملا: ”اس معرکے کے جوڑ چھوڑ کر کتابوں میں سر کون مارتا۔ اسکی دلوں سے آرزو ہوتی۔“

سعید: ”یار آج اڑ آئے تو کیا۔ حق یہ ہے کہ تمہارا وہاں رہنا سہم ہے۔ روز تو نہ آگے۔“

اور یہاں آئے دن نئی نئی سیریں۔ نئی نئی دلچسپیاں۔ کل لال ٹوگی پر۔ پرسوں پٹے

پر۔ نرسوں پڑے کا میلہ کہاں تک گناؤں۔ تمہارا جان بڑا ہوا۔

کملا: ”کل کی کٹاؤ تو بندہ ضرور دیکھ گیا۔ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر رہے۔“

سعیدؔ اور پڑونا میلہ نہ لکھا تو حسرت رہ جائیگیؔ

سہ پہر کے وقت کلاچرن یاران شاطر سے رخصت ہو کر بادل ناخواستہ
بورڈنگ ہاؤس کی طرف چلا دل میں ایک چورسا بیٹھا ہوا تھا۔ دروازہ پر پہنچ کر جھانکنے
لگا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب ہنوں تو لپک کر کمرہ میں چلا جاؤں۔ مگر دیکھتا ہے تو وہ بھی
باہر ہی کی طرف آ رہے ہیں۔ دل کو خوب مضبوط کر کے اندر داخل ہوا سپرنٹنڈنٹ صاحب
بولے ”اب تک کہاں تھے؟“

لہجہ ایسا دشت تھا کہ کلاچرن ہنسل ترکی بہ ترکی جواب دینے سے باز رہا مگر وہ
انداز سے بولا ”ایک ضرورت سے بازار چلا گیا تھا“
سپرنٹنڈنٹؔ ”یہ بازار جانیکا وقت نہیں ہے“
کلاچرن مجھے معلوم نہیں تھا آئندہ سے احتیاط رکھوں گا“

رات کو جب کلاچرن باپ پر لٹا تو سوچنے لگا یا راج تو بیچ گیا۔ مگر مزہ تو جب ہو کر
کل بھی بچوں۔ اور پرسوں بھی حضرت کے آنکھوں میں خاک ڈالوں۔ کل کا نظارہ واقعی
قابل دید ہو گا۔ کنکوے آسمان سے باتیں کریں گے۔ اور لمبے لمبے پیچ ہونگے۔ نوشاد مرزا
بلا کی بازی لڑاتا ہے۔ یہ خیال کرتے کرتے سو گیا۔ دوسرے دن پھر علی الصبح
بورڈنگ ہاؤس سے نکل بھاگا۔ یاران دلنواز لال فگلی پر آسکے غنظر تھے۔ دیکھتے ہی
باغ باغ ہو گئے۔ اور بیٹھ مٹھوکی۔

کلاچرن کچھ دیر تک تو کٹا بھوکھ تھا رہا۔ پھر شوق چڑا یا کہ کیوں نہ میں بھی اپنے
کنکے منگاؤں۔ اور اپنی تیز دستی کے کرتب دکھاؤں۔ سعید نے بھڑکایا بدبکر
لڑاؤ۔ رہ پیہ ہم دیکھنے۔ جٹ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ مکان پر آدمی دوڑا دیا۔ کامل یقین تھا

کہ اپنے مانجھے سے یہاں سٹھڑا کر دوں گا۔ مگر آدمی گھر سے غالی ہاتھ لوٹا۔ تب تو حضرت کو تاب نہ رہی۔ بدن میں آگ سی لگ گئی۔ ہنٹر لیکر دوڑے اور مکان پر آتے ہی کہا روکو ایک سرے سے سٹر سٹریٹ شروع کیا۔ غریب بیٹھے حقہ تنباکو کر رہے تھے۔ ہنٹر پڑے اور بے خطا۔ بیغصور تو بیچیں مار مار کر رونے لگے۔ سارے محلہ میں ایک شور مابرپا ہو گیا۔ کسی کے سمجھ میں نہ آیا کہ ہماری کیا خطا ہے۔ یہاں کہا روں کی خاطر خواہ مرست کر کے کھلا چرن اپنے کمرہ میں ہو پختے۔ مگر وہاں کی کیفیت دیکھ کر غصہ ہمارے درجہ تک پہنچ گیا۔ تپنگ پھٹے ہوئے تھے۔ چرخیاں لوٹی ہوئی۔ اور مانجھے کی پتھیاں الٹی ہوئی۔ گویا کسی دبانے ان ہوائی جنگ آوروں کا ستیاناس کر دیا۔ سمجھ گئے کہ فردِ امان نے یہ حرکت کی ہے۔ غصہ سے لالہاں کے پاس آئے۔ اور زور زور سے کہنے لگے گیدوں اماں۔ کیا تم سچ مچ میری جان ہی لینے پر آگئی ہو۔ تین دن ہوئے قید خانہ میں بھجوا دیا۔ مگر اتنے پر بھی کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ میری دلچسپی کے جو سماں تھے وہ سب برباد کر ڈالے۔ کیوں؟

پرمیوٹی (ہجرت سے) ”میں نے تو تمہاری کوئی چیز نہیں چھوئی۔ کیا ہوا؟“
 کلامد بگڑ کر ”جھوٹوں کے منہ میں کیڑے پڑتے ہیں۔ اگر تم نے میری چیزیں نہیں چھوئیں تو کسکی مجال ہے جو میرے کمرہ میں جا کر میرے نکلے اور چرخیاں سب توڑ پھوڑ ڈالے۔ کیا اتنا بھی نہیں دیکھا جاتا؟“
 پرمیوٹی ”تمہارے سر کی قسم میں نے اس کمرہ میں قدم نہیں رکھا۔ چلو دیکھو کون کون چیزیں لوٹی ہیں؟“

یہ لکھ پرمیوٹی تو اس کمرہ کی طرف چلی۔ اور کلامد غصہ میں بھرے آنکھوں میں کھڑے

رہے کہ اتنے میں مادھوی برجن کے کمرہ سے نکل اور اُنکے ہاتھ میں ایک رقمہ دیکر
چلی گئی۔ لکھا ہوا تھا۔

خطا میں نے کی ہے خطا وار ہوں + سزا دیکھئے جو سزا وار ہوں
یہ پُرزہ دیکھتے ہی کلا بھیگی آبی ٹکیا دیے بانوں مردانے کی طرف چلائے پریموتی نے پردہ
کی اڑے سسکتے ہوئے نوکروں کو ڈاٹنا ڈپٹنا شروع کیا تھا۔ اُسے منع کیا اور اُس وقت
چند اور کنکڑے جو بچے ہوئے تھے پھاڑ ڈالے۔ چرخیاں ریزہ ریزہ کر ڈالیں اور ڈور میں
دیا سلانی لگا دی۔ ماں اُسکی یہ مجنونا نہ حرکت دیکھ رہی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ماجرا
ہے۔ کہاں تو ابھی ابھی انھیں چیزوں کے لئے دنیا سر ہڑاٹھالی۔ اور کہاں خود ہی اُنکے
پچھے پڑ گئے۔ سبھی شاید مارے غصہ کے یہ حرکت کر رہے۔ منانے لگی۔ مگر کلا کے چہرے سے
غصہ مطلق ظاہر نہ ہوتا تھا۔ سنجیدگی سے بولا۔ ”میں غصہ میں نہیں ہوں۔ آج سے بچا ارادہ
کرتا ہوں کہ تنگ کبھی نہ اڑو لگا۔ میری حماقت تھی کہ ان چیزوں کے لئے آپ سے جھگڑا بھلا“
جب کلا چرن کمرہ میں اکیلا رہ گیا تو سوچنے لگا بیشک میرے کنکڑے اڑا رہیں
نا پسند ہے۔ دل سے نفرت کرتی ہیں۔ ورنہ مجھ پر ظلم ہرگز درگیش۔ کاش اکیلا رہا اُسے ملاقات
ہو جاتی تو پوچھتا کہ تمہاری کیا مرضی ہے۔ مگر کون مرنہ دکھاؤ لگا۔ ایک نوکڑہ مغز۔ اُس پر اپنی
حماقت کے کئی باریثوت دے چکا۔ سیند والے معاملہ کی خبر انھیں ضرور ہی ہوئی ہوگی۔
انھیں صورت دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ اب تو یہی علاج ہے کہ یا تو اُلکی صورت دیکھوں
اور نہ اپنی دکھاؤں۔ یا کسی طرح کچھ علم حاصل کروں۔ ہاے! ظالم نے کیسی صورت پائی ہے۔
حسرت نہیں جو معلوم ہوتی ہے۔ کیا کبھی وہ دن بھی ہوئے کہ میں اُسے پیار کروں گا۔
اور میرے پیار کے بدلے وہ بھی مجھے پیار کر لگی۔ اس وقت تو شاید میں شادی کر کے جو جاؤں

کیا سترخ منہ ریلے ہونٹ ہیں۔ گرہے ظالم۔ رحم تو اسے چھینیں گیا۔ کہتی ہے سزا دی گئی۔ جو سزا دیوں۔ کیا سزا دیوں۔ اگر آجاؤ تو گلے سے لگا لوں۔ اور انگلیتہ سے لوں۔ یہی تھا سزا ہے۔ اور بشرط زندگی کبھی نہ کبھی یہ سزا دیکھا ضرور۔ اچھا تو اب آج سے پڑھنا چاہئے۔ یہ سوچتے سوچتے اٹھا اور درجہ کھول کر کبوتروں کو اڑانے لگا۔ سیکڑوں ہی جوڑے تھے۔ ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر آسمان میں تارے بن جائیں۔ اڑیں تو دن بھر اترنے کا نام نہ لیں۔ شہر کے کبوتر باز ایک ایک جوڑے کے بدلے غلامی لکھانے کو تیار تھے۔ مگر دم زدن میں سب کے سب اڑا دیے۔ جب درجہ صاف ہو گیا تو کہا رو کو حکم دیا کہ اسے اٹھا لیا جاؤ۔ اور آگ میں جلادو۔ چھتہ بھی گرا دو۔ ورنہ سب کبوتر اسپر اگر بیٹھیں گے۔ کبوتروں کا قصبہ پاک کر کے بٹیروں اور بلیوں کی طرٹ مخاطب ہوئے۔ اور انھیں بھی ہند قصبہ سے آڑا کر دیا۔

باہر تو یہ گل کھلا ہوا تھا۔ اندر پر موتی چھاتی پیٹ ہی تھی کہ نہیں معلوم لڑکا کیا کرنے پر آیا ہے۔ برج کو بلا کر کہا۔ بیٹی بچا کو کسی طرح روکو۔ نہیں معلوم اسے دل میں کیا ٹھانی ہے۔ یہ لکڑی روٹے لگی۔ برج کو کبھی شک ہو رہا تھا کہ ضرور اُغصوں نے کچھ اور نیت کی ہے۔ ورنہ اس جھلہٹ کے کیا معنی۔ گو کمالا بدشوق تھا۔ بدخلق تھا۔ ادارہ تھا ملکات۔ عیبوں کے ساتھ اس میں ایک بڑا وصف بھی تھا۔ جسکی کوئی عورت ناقدری نہیں کر سکتی۔ اسے برج رانی سے سچی محبت تھی۔ اور اسکا نادانستہ طور پر کئی بار اظہار ہو چکا تھا۔ یہی سبب تھا جسے برج کو اتنا دلیر بنا دیا تھا۔ اسے کاغذ نکالا اور یہ پڑزہ باہر بھیجا۔

پیارے! یہ ننگی کس پر ہے کیا۔ مجھ اور محض اسنے کہ میں نے حملت کر کے دو تین لکڑیے پھاڑ ڈالے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اتنی سی بات پر ایسے برگزنتہ ہو جائیں گے

تو ہرگز انھیں ہاتھ نہ لگاتی مگر اتنا تو خطا ہو گئی۔ معاف فرمائیے۔ یہ پہلی خطا ہے۔

آپ کی برج رانی

کھلا چرن یہ خطا کر ایسا خوش ہوا گویا ساری دنیا کی دولت ہاتھ لگ گئی۔

جواب دیئے کا شوق پڑا۔ مگر قلم ہی نہیں اٹھتا۔ نہ انقباض ملتا ہے۔ نہ آداب۔ نہ اٹھان کا خیال ہوتا ہے۔ نہ خاتمہ کا۔ ہر چند چاہتا ہے کہ کوئی عاشقانہ رنگ کا پھر لکنا ہو خط لکھوں۔ مگر عقل ذرا بھی نہیں دوڑتی۔ آج پہلی بار کھلا چرن کو اپنی بے علمی اور جہالت پر رونا آیا۔ افسوس! میں ایک سیدھا سادہ لکھنا بھی نہیں لکھ سکتا۔ اس خیال سے وہ روئے لگا۔ اور کمرہ کے دروازے بند کر لئے کہ کوئی دیکھ نہ لے۔

سہ پہر کی وقت منشی شیاما چرن گھر پر آئے تو سب سے پہلی چیز جو نظر پڑی وہ

اگل کا الاؤ تھا۔ نوکروں سے متعجب ہو کر پوچھا یہ الاؤ کیا ہے۔ نوکروں نے جواب دیا ”حضور در باطل رہا ہے۔“

منشی جی (گھر کی کر) اسے کیوں جلاتے ہو۔ کیوتر کہاں رہیں گے۔“

کمار ”چھوٹے بابو کا حکم ہے کہ سب در بے جلا دو۔“

منشی جی ”کیوتر کہاں گئے۔“

کمار ”سب اڑا دیئے ایک ہی نہیں رکھا۔ لکھو سب پھاڑ ڈالے۔ ڈور جلا دی۔“

بڑا کسان کیا؟ کمار نے اپنے والنت میں مار پیٹ کا بدلہ لیا۔ غریب سمجھا کہ منشی جی اس

نقصان کے لئے کھلا چرن کو سخت شست کیں گے۔ مگر منشی جی نے یہ ماجرہ آسان تو

کئے میں آگئے۔ انھیں جانوروں پر کھلا چرن جان دیتا تھا۔ آج یکایک کیا کا یا لپٹ ہو گئی۔ ضرور کچھ وال میں کالا ہے۔ کمار سے کہا بچہ کو بچھو۔ وہ ایک منٹ میں کمار نے آگ لیا

انجور درو تہ اندر سے بندھے بہت کھٹکھٹایا کھولتے ہی نہیں۔“

اتنا سنا تھا کہ منشی جی کا خون خشک ہو گیا۔ فوراً شنبہ ہوا کہ بچہ نے زہر کھالیا۔ آج ایک زہر خورانی کا مقدمہ فیصل کر کے آئے تھے۔ ننگے پاؤں دوڑے۔ اور بندکرہ کے صوف پر زور سے لات مار کر کہا ”بچہ بچہ!“ یہ کہتے کہتے گلا پھنس گیا۔ کھلانے باپ کی آواز سنی۔ تو فوراً آنسو پونچھ ڈالے۔ اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ مگر اسے کتنا تعجب ہوا جب منشی جی نے بجائے لمن طعن کرنے کے اسے سینہ سے لپٹالیا اور گھبرا کر پوچھا ”بچہ تمہیں میرے سر کی قسم بتا دو۔ تمہنے کچھ کھا تو نہیں لیا؟“ کھلا چہرہ نے اس سوال کا مطلب سمجھنے کے لئے منشی جی کی طرف آنکھیں اٹھائیں تو انہیں آنسو تھے۔ منشی جی کو اب یقین کامل ہو گیا کہ ضرورت آفت آگئی۔ ایک کمار سے کھا ڈکٹر صاحب کو بلا لا۔ کھانا بھی چلے۔ اب جلے کنڈھن کھلا باپ کی اس گھبراہٹ کا مطلب سمجھا۔ دوڑ کر اسے لپٹ گیا اور بولا ”آپ کا شنبہ بالکل بیجا ہے۔ آپ کے سر کی قسم۔ میں بالکل اچھا ہوں۔“

مگر ڈپٹی صاحب کے ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ سمجھے یہ مجھے روک کر دیر کیا جا رہا ہے۔ تاکر اپنا کام تمام کرے۔ منت کر کے بولے بچہ! لیٹور کے لئے مجھے جھوٹ دو۔ میں صندوق سے ایک دو الٹا آؤں۔ میں کیا جانتا تھا کہ تم اس نیت سے بورڈنگ ہوس جا رہے ہو۔

کہلا ”بھد میں بالکل اچھا ہوں۔ آپ کا شنبہ بالکل غلط ہے۔ میں ایسا غیر متند ہوتا تو آج ایسا جاہل تھوڑے ہی بنا رہتا۔ آپ خواہ مخواہ ڈاکٹر صاحب کو بلا رہے ہیں۔“

منشی جی۔ ”کچھ کچھ یقین کر کے“ کو اڑ بند کر کے کیا کر رہے تھے؟

کہلا۔ ”جی اندر سے ایک خط آگیا تھا اسکا جواب لکھ رہا تھا۔“

منشی جی۔ ”اور یہ کہوترو غیرہ کیوں اڑا دیئے؟“

کہلا۔ اسی لئے کثوب الطینان سے بڑھوں۔ انھیں خرافاتوں میں میری وقت ضائع ہو جاتا تھا۔ آج میں نے آنکھ خاتمہ کر دیا اب آپ دکھیں گے کہ میں کیسی اچھا ہوں“
 بد سے ڈیڑھی صاحب کے ہوش بجا ہوئے۔ اندر اگر پریموتی سے حال پوچھا تو
 اُس نے سدی رامائن کہہ سنائی۔ انھوں نے جب سنا کہ برجن نے غصہ میں اگر کہلا کے
 نکلے پھاڑ ڈالے۔ اور چرخیال توڑ ڈالیں تو بے اختیار حس پڑے اور کہلا کی لمبی سیونگی
 خانہ بربادی کا ساز بھج میں آگیا۔ بس لے قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا ان لال کو درح کر کے
 پھوڑیگی۔ آجکل دفتر سے آتا ہوں تو اکثر گھر ہی پر بیٹھے پاتا ہوں۔ کبھی کبھی کتاب بھی کھلی
 ہوئی نظر آتی ہے۔ آگے حضرت بیوی کے پنجہ میں۔ دیکھ لینا اب سنصل جائینگے۔“

پندرھویں فصل بدگمانی

ہم رانی کی رخصتی کے بعد شباما کا گھر ایسا سونا ہو گیا گویا قفس سے چڑیا رڈ گئی۔
 وہ اس گھر کا آجالا۔ اور اس جہم کی جان تھی۔ مکان دی ہے۔ مگر درودیار پر حسرت چھائی ہوئی
 ہے۔ لیکن وہی ہیں مگر سب کے چوے افسردہ اور انکھیں غمناک ہو رہی ہیں۔ گلشن دی ہے۔
 مگر خزاں رسیدہ۔ رخصتی کے بعد مینہ بھر کے اندر منشی سیمون لال بھی تیرتھ جاتا کو سدھا
 مال دولہا جو کچھ تھاپنا پ کو سوئپ دیا۔ اپنے ساتھ مرگ چھالا۔ بھگوت گیتا اور چند لہو لہو کے
 سوا اور کچھ نہ لینگے۔

پرتاپ چند پُر زور محسوسات کا نوجوان تھا۔ مگر اسکے ساتھ ہی ضبط کی انتہائی قوت بھی اُسے حاصل تھی۔ مکان کی ایک ایک چیز سے برجن کی یاد دلائی مانتی۔ یہ خیال دل سے ایک لمحہ کے لئے بھی دور نہوتا کہ کاش برجن میری ہوتی تو کیسے لطف سے زندگی بسر کرتی۔ مگر اس خیال کو وہ دور کرتا رہتا تھا۔ پڑھنے بیٹھا تو کتاب کھلی رہتی اور خیال کہیں اوجا پہنچتا۔ کھانا کھانے بیٹھا تو برجن کی صورت آنکھوں میں پھرنے لگتی۔ جذبہ محبت کو ضبط کی طاقت سے دباتے دباتے یہ حال ہو گیا گو یا بر رسول کا مریض ہے۔ عشاق کو اپنے تنہاؤں کے پوری ہوسنے کی امید ہو یا نہ ہو۔ مگر وہ دل ہی دل میں اپنے معشوق کے دیدار کا لطف اٹھاتے رہتے ہیں۔ وہ عالم خیال میں معشوق سے باتیں کرتے ہیں پھر تیرے ہی روٹھتے ہیں۔ مناتے ہیں۔ ان تصورات سے انھیں تسکین ہوتی ہے۔ اور دلوں کو ایک پُر مزہ اور خوشگوار شغل ہاتھ آتا ہے مگر کاش کوئی طاقت انھیں اس گلشن خیال کی سیر کرنے سے روکے کاش کوئی طاقت انھیں خیال میں بھی تصویر یا کادیاں کرنے دے تو ان بد قسمت بندگانِ محبت کی کیا گت ہوگی پرتاپ انھیں قسمتِ شغفوں میں تھا۔ اسیں شک نہیں کہ وہ چاہتا تو سرسبز خوش خیالات کا لطف اٹھا سکتا تھا۔ عالم خیال کی سیرِ ظاہری پسپیو سے کم لطف نگاہِ بندِ حق مگر مشکل تو یہ تھی کہ وہ برجن کے خیال کو بھی عاشقانہ جذبات کی آلائش سے پاک رکھنا چاہتا تھا۔ اسکی ترسیتا یہ پاکیزہ ماحول پر ہونی تھی۔ اور اُسے ایک نیک منش پاک باطن بزرگ کی صحبت سے فیض اُٹھانے کے ایسے اچھے موقع ملے تھے کہ اُسکی منگاہوں میں خیالات کی پاکیزگی کی اتنی ہی وقعت تھی جتنی غم کی پاکیزگی کی۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ برجن کو۔ جسے بارہا بہن کہہ چکا تھا۔ جسے اب بھی بہن سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ عالم خیال میں بھی ایسے تصورات اور جذبات کا مرکز بناتا جو خباثت سے کیسے ہی پاک ہوں۔ مگر نفیس سرکش کی حوصلہ افزائیوں سے آزاد نہیں ہو سکتے تھے۔ جب تک منشی سمیعون لال موجود تھے اُسکا کچھ نہ کچھ وقتہ انکا رہا۔

گیان اور معرفت کے چرچوں میں کٹ جاتا تھا۔ جس سے سوچ کو گوندھنی ہوتی تھی۔ مگر اُنکے چلے جانے کے بعد تزئینت لفس کے یہ موقع بھی جاتے رہے۔

سُبا با اُسے ہر دم و لگرفتنہ پانی تو اُسے بہت حد مرہ ہوتا۔ ایک روز اُسے کیا کہ تمہاری طبیعت یہاں نہ لگتی ہو تو کچھ دنوں کے لئے الہ آباد چلے جاؤ۔ وہاں شاید تمہاری طبیعت بحال ہو جاوے۔ یہ خیال پرتاپ کے دل میں کئی بار پیدا ہوا تھا۔ مگر اس خوف سے کہ لائیں کو تنہائی بہت شاق گذریگی اُس نے کبھی اس تجویز پر غور نہیں کیا تھا۔ ماں کی طرف سے اشارہ پایا تو ارادہ بچتہ ہو گیا۔ سفر کی تیاریاں کرنے لگا۔ روانگی کا دن مقرر ہو گیا۔ اب سُبا کا یہ حال ہے کہ جب دیکھتے پرتاپ کو پردیس میں رہنے سننے کے متعلق ہدایتیں کر رہی ہے۔ بیٹا دیکھو کسی سے راز مت مول لینا۔ جھگڑائی تو تمہاری ویسے بھی عادت نہیں ہے۔ مگر سمجھا دیتی ہوں۔ پردیس کا واسطہ ہے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ کھانے پینے میں بے احتیاطی نہ کرنا۔ تمہاری یہ جڑی عادت ہے کہ جاٹوں میں سر شام سے سو جلتے ہو پھر کوئی کھانے کے لئے کتنا ہی جگائے سکتے تک نہیں۔ آپ بھی آپاس کر سکتے ہو۔ دوسروں کو بھی آپاس کرتے ہو یہ عادت پردیس میں بنی ہی تو تمہیں رات کا کھانا کا ہیکو مسر ہو گا۔ دن کو زرا دیر کے لئے آرام کر لیا کرنا۔ تمہارے اُنکھوں میں تو دن کو جیسے غینہ ہی نہیں رہتی۔ اُسے جب موقع ملتا بیٹھے کو ایسی ہی مادرانہ نصیحتیں کیا کرتی۔

آخر روانگی کا دن آپونچا۔ گاڑی دس بجے دن کو چھوٹی تھی۔ پرتاپ نے سوچا برجن سے ملاقات کر لوں۔ پردیس جا رہا ہوں۔ پھر نہ جانے کب ملاقات ہو۔ دل نے گد گدایا۔ ماں سے کہ بیٹھا۔ سُبا بہت خوش ہوئی۔ ایک طشت میں حلوا اور سمو سے اور دو تین قسم کے دُبتے رکھ کر دھیا کو دینے کے لٹوکے ساتھ جا۔ پرتاپ نے خط صاف کیا کپڑے

وہ اسے دیکھنے ہی دوڑی۔ اور خیر و عافیت پوچھنے لگی۔ ”لالہ کی کوئی چٹھی آئی تھی؟“
 روحیہ۔ ”جب سے گئے چٹھی پتر کچھ نہیں آوا“

برجن۔ ”جی تو آرام سے ہیں“

روحیہ۔ ”للو بالو پرگ راج جات ہیں توں تک آوا س رست ہیں“

برجن۔ ”(جو تک کر) للو پرگ جاسہے ہیں“

روحیہ۔ ”ہاں۔ ہم سب بہت سمجھاوا کہ پردیس میں کہاں جیسو۔ مڈاکو کی سنت ہیں؟“
 برجن۔ ”کب جائیں گے؟“

روحیہ۔ ”آج دس بجے کے ٹیم سے جویا ہیں۔ تم سے بھینٹ کرن آوت رہے۔ توں
 دوار پر آئے کے لوٹ گئے۔“

برجن۔ ”یہاں تک آسکے لوٹ گئے۔ دروازہ پر کوئی نہ پایا نہیں؟“
 روحیہ۔ ”دوار پر کہاں آئے۔ سڑک پر سے چلے گئے۔“

برجن۔ ”کچھ کہا نہیں کیوں لوٹا جاتا ہوں؟“

روحیہ۔ ”کچھ نہیں۔ اتنا بولے کے ہمارے ٹیم چھوٹ جیسے توں ہم جانت ہیں“

بسج رانی نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ اکٹھ بجنے والے تھے۔ پرمیوتی کے پاس
 ہاگر ہوئی۔ ”اماں اللو آج الہ آباد جا رہے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو ذرا اُن سے ملتی آؤں۔ پھر نہ جاؤں
 کب ملنا ہو کب نہ ہو مہری کہتی ہے کہ وہ مجھے ملنے آتے تھے مگر سڑک کے اُسی پار سے لوٹ گئے۔“
 پرمیوتی۔ ”ابھی نہ بال گندھوے۔ نہ مانگ بھر وائی۔ نہ کپڑے بدلے۔ اور جانے کو

تیار ہو گئیں“

برجن۔ ”میری اماں جی آج جانے دیجئے۔ بال آں گندھوے بیٹیوں کی تو دس ہیں بچ جائیں گے“

پر مچھوٹی۔ اچھا تو جاؤ۔ مگر شام تک لوٹ آنا۔ گاڑی تیار کرالو۔ میری طرف سے سب اٹھ کر
 پالا لگن کمدینا۔ برجن لپکی ہوئی کمرہ میں آئی۔ کپڑے بدلے۔ مادھوی کو باہر دھڑایا
 کہ گاڑی تیار کرنے کے لئے کہہ آتب تک کچھ خیال آیا۔ روھیا سے پوچھا کچھ چٹھی تر
 نہیں دیا۔

روھیا نے چہرہ نکال کر دیدیا۔ برجن نے اُسے بڑے شوق سے لیا۔ مگر اُسے
 بڑھتے ہی سکا چہرہ کھلا گیا۔ سوچنے لگی کہ وہ دروازہ تک آکر کیوں لوٹ گئے۔ اور خط
 بھی لکھا تو ایسا اکھڑا۔ مہل۔ چہ خوش! اُسے عجلت کے باعث نہ مل سکے۔ ایسی کیا
 عجلت تھی۔ کیا گاڑی کے نوکر تھے۔ دن بھر میں کچھ نہیں تو پانچ چھ گاڑیاں جاتی ہوگی۔
 کیا مجھے ملنے کے لئے اُن سے دو گھنٹہ کی دیر بھی برداشت نہو سکی۔ ضرور اس میں کچھ
 نہ کچھ راز ہے۔ مجھے کون سی خطا ہوئی۔ کیا ایک اُسے اس وقت کی یاد آتی جب وہ عالم
 بیقراری میں پر تپا پ کے پاس گئی تھی۔ اور اُس کے زبان سے مچلا تھلا۔ لالو مجھے کیسے
 صبر ہوگا۔ برجن کو اب سے پہلے کئی بار خیال آچکا تھا کہ میرا اس وقت کا۔ اور اس حالت
 میں جانا۔ بہت ہی نامناسب تھا۔ اس وقت یقین ہو گیا کہ میں ضرور لالو کی نگاہوں میں
 گر گئی۔ میری محبت اور عزت اب اُن کے دل میں نہیں ہے۔ ایک ٹھنڈی سانس لیکر بیٹھ گئی۔
 اور مادھوی سے بولی ”کوچان سے کمدے گاڑی نہ تیار کرے۔ میں نہ جاؤنگی۔“



سوٹھویں فصل

فرض اور محبت کی کشمکش



جس وقت تک برج رانی سسرال نہ آئی تھی اُسکی نگاہوں میں ایک ہندو پتی بڑا عورت کے فرائض اور ذمہ داریوں کا کوئی اعلیٰ معیار نہ قائم ہوا تھا۔ گھر میں کبھی اُسکے شوہر کا ذکر نہ آتا۔ یا اگر آتا تو ناخوشگوار طریقے پر۔ اسنے استری دھرم کی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ مگر انکا کوئی مدد نہ ملا اور متحرک اثر اُسپر نہ ہوا تھا۔ غالباً اُسے یہ خیال ہی نہ آتا کہ یہ گھر میرا نہیں ہے۔ اور مجھے بہت جلد یہاں سے جانا پڑے گا۔

مگر جب وہ سسرال میں آئی۔ اور اپنے دل و جان کے مالک۔ اپنے آقا۔ اپنے شوہر کو ہر دم آنکھوں کے سامنے دیکھنے لگی تو رفتہ رفتہ اُسکے دل کی کیفیت متغیر ہونا شروع ہوئی۔ روشن ہو کہ میں کون ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میرا کیا دھرم ہے اور مجھے کس طرح اپنا دھرم نبھانا چاہئے۔ اگلی باتیں خواب سی معلوم ہونے لگیں۔ ہاں جس وقت یاد آجاتا کہ کم از کم ایک خطا مجھ سے ایسی ہوتی ہے جسکی میں تلافی نہیں کر سکتی۔ تو وہ خود بخود شرم سے سر جھکا لیتی اور اپنے تئیں کوستی۔ اسے تعجب ہوتا کہ مجھے لالو کے سامنے جانے کی کیونکر جرأت ہوئی۔ شائد اس واقعہ کو خواب سمجھنے کی کوشش کرتی۔ تب لالو کی شریفانہ صورت اُسکے پیش نظر ہو جاتی۔ اور وہ صدق دل سے اُسے دعا دیتی۔ روز بروز اُسکی محبت اور عزت دل میں زیادہ ہوتی جاتی تھی۔

لیکن آج جب پرتاپ چندر کی تلون مزاجی سے اُسے یہ خیال کرنے کا موقع ملا کہ لڑاؤ اس واقعہ کو ابھی بھولا نہیں ہے اور اُسکی نگاہوں میں میری وقعت نہیں رہی۔ یہاں تک کہ وہ میری صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہے۔ تو اُسے حسرتناک غصہ پیدا ہوا۔ پرتاپ کی طرف سے طبیعت مکدر ہو گئی اور اُسکی جو محبت اور عزت دل میں تھی وہ دم زدن میں بانی کے انجرات کی طرح غائب ہونے لگی۔ عورتیں انتہاء درجہ کی ذکی احساس ہوتی ہیں۔ وہ جتنی بُر دلی۔ اور کیوں نہ ہو۔ اتنی ہی سرگرمی سے نفرت بھی کر سکتی ہیں۔ جس پرتاپ کے لئے وہ اپنی ہستی خاک میں ملا دیے کو تیار تھی وہ اُسکے ایک طفلانہ فعل کو بھی درگزر نہیں کر سکتا۔ کیا اُسکا دل ایسا تنگ ہے! یہ خیال برجن کے پہلو سے دل میں کھٹنے کی طرح کھٹکنے لگا۔

آج سے برجن کی زندہ دلی نصبت ہو گئی۔ دل پر ایک بوجھ سا رہنے لگا۔ سوچتی کہ جب پرتاپ مجھے بھول گئے اور میری رتی بھر بھی عزت نہیں کرتے تو اس صدمہ سے میں کیوں اپنی جان کھپاؤں۔ جیسے رام تلپی سے دیئے تلپی رام سے۔ اگر انھیں مجھ سے نفرت ہے۔ اگر وہ میری صورت سے بیزار ہیں۔ تو میں بھی اُنکی صورت سے منفرد ہوں۔ اور مجھے بھی اُننے ملنے کی خواہش نہیں۔ تب وہ اپنے ہی اوپر جھنجھلا اُٹھتی کہیں ہندم انھیں کی باتیں کیوں سوچا کرتی ہوں۔ اور ارادہ کرتی کہ اب اُسکا خیال بھی دل میں نہ اُٹنے دوں گی۔ مگر ذرا دیر میں خیال پھر اُسی طرف جا پہنچتا۔ اور وہی خیالات بے چین کرنے لگتے۔ تجلی اور خیالی انتقام کے جوش میں وہ کمالا چرن سے غلوں محبت کا اظہار کرنے لگی۔ وہ ذرا دیر کے لئے کہیں چلا جاتا تو اُس سے شکایت کرتی۔ جتنے نقد روپے جمع کر رکھے تھے وہ سب اُسے دیدیئے کہ اپنے لئے سونے کی گھڑی اور طلائی چین خریدے۔ کمالا نے ذرا اٹکایا

قو ابدیدہ ہو گئی۔ وہ یوں ہی اُسکا غلام بنا ہوا تھا۔ اُسکی محبت کا یہ رنگ دیکھ کر اور بھی جان دینے لگا۔ دوستوں نے سنا تو مبارکبادیں دینے لگے میاں حمید اور سعید اپنی اپنی قسمتوں کو کونے لگے کہ ایسی محبتی بیوی ہکونہ ملی تھیں وہ بنانا گئے ہی یوں سرفراز کرتی ہیں۔ اور یہاں بیویوں کی فرمائشوں کے مارے ناک میں دم ہے۔ چاہے اپنے پاس کافی کوٹری نہ ہو۔ مگر اُنکی فرمائشیں ضرور پوری ہونی چاہئیں۔ ورنہ طوفان نوح برپا ہو جائے۔ اجی اور کیا کہیں کبھی گھر میں ایک پٹرے پان کے لئے چلے جاتے ہیں تو وہ بھی بے دس پانچ اُلٹی سیدھی سُننے نصیب نہیں ہوتا۔ خدا ہکو بھی تمہاری سی بیوی عطا کرے۔

یہ سب تھا۔ کلاچرن بھی محبت کرتا تھا۔ اور برن رانی بھی محبت کرتی تھی۔ مگر وہ دونوں ملنے سے جو مسرت حاصل ہوتی ہے اُسکا برجن کے چہرہ پر مطلق نشان نہ تھا۔ روز بروز زرد اور نحیف ہوتی جاتی تھی۔ کلاچرن قسمیں دے دیکر لو پھٹتا کہ تم دُلی کیوں ہونی جاتی ہو۔ اُسے خوش رکھنے کی جو جو تدبیریں بن پڑیں کرتا یا دوستوں سے بھی اس اہم معاملہ میں مشورہ لیتا۔ مگر کچھ کارگر نہ ہوتا تھا۔ برن رانی ہنس کر کہہ دیا کرتی کہ تم کچھ فکر نہ کرو۔ میں بالکل اچھی ہوں۔ یہ کہتے کہتے اُنھکا اُسکے بالوں میں کنگھی کرنے لگتی۔ یا ہانکھیا جھٹلنے لگتی۔ ان خاطر داریوں سے کلاچرن پر خونخوار ہو جاتا۔ مگر لکڑی کے اوپر رنگ روغن لگانے سے وہ کیرا نہیں مڑتا جو اندر میٹھا ہوا اُسکا کلیجہ کھائے جاتا ہے۔ یہ خیال کہ پر تاپ چند مچھے بھو لگئے۔ اور میں اُنکی نظروں میں گر گئی ناسور کی طرح اُسکے کلیجہ میں چھید کیا کرتا تھا۔ اُسکی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ بستر سے اُٹھنا مشکل ہو گیا۔ ڈاکٹروں کا علاج ہونے لگا۔

اُدھر پرتاپ چندر کی طبیعت الہ آباد میں سنبھل چلی تھی۔ ورزش کا تو اُسے شوق

تھا ہی۔ وہاں اسکا خوب چر چا تھا۔ غم غلط کرنے کا اچھا مشغلہ ہاتھ آیا۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے جہانی محنت سے بڑھکر اور کوئی علاج نہیں ہے۔ صبح کو جہنا شک اور کشتی۔ شام کو کرکٹ اور فٹ بال۔ آٹھ نو بجے رات تک باغیوں کی سیر۔ اتنی محنت کے بعد چار پانی پر گرتا تو سویرے اٹھ کھٹتی چھ ہی مہینوں میں کرکٹ اور فٹ بال کا کپتان بن بیٹھا۔ اور دو تین میچ ایسے معرکے کے کھیلے کہ سارے شہر میں دھوم ہو گئی۔

آج علی گڑھ کے ایک زبردست ٹیم سے اٹکا کرکٹ میں مقابلہ تھا۔ یہ ٹیم ہندوستان کے مشہور ٹیموں کو شکست دیتی۔ فتح کا ڈنکا بجاتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ انھیں غالباً اپنی فتح کی جانب سے بہت اندیشہ نہ تھا۔ وہ کئی مضبوط ٹیموں سے ہالا مار چکے تھے۔ مگر اسکے ساتھ ہی الہ آباد والے بھی مایوس نہ نظر آتے تھے۔ انکی امیدیں پرتاپ چندر سے وابستہ تھیں۔ اگر وہ آدھ گھنٹہ بھی جم گیا تو رنوں کے انبار لگادیکھا۔ اور اگر اتنی ہی دیر تک گیند چل گیا تو پھر آدھ کا وارا نیا رہے۔ پرتاپ کو کبھی اتنا بڑا میچ کھیلنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ کلیجہ بانسوٹ اٹھل رہا تھا کہ جانے کیا نتیجہ ہو۔ دس بجے کمیل شروع ہوا۔ پہلے علی گڑھ والوں کے کھیلنے کی باری تھی۔ اور دو ڈھائی گھنٹہ تک انھوں نے خوب جوہر کمال دکھائے۔

ایک بجتے بجتے کھیل کا پہلا حصہ ختم ہوا۔ علی گڑھ نے ۴۰۰ رن کئے۔ اب الہ آباد والوں کی باری آئی۔ مگر کھلاڑیوں کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔ یقین ہو گیا کہ بیٹریج ہارے۔ اب عمدہ براہونہ محال ہے۔ اتنے رن کون کرے گا۔ اکیلے پرتاپ کیا بنا لے گا۔ پھلا کھلاڑی آیا اور تیسرے گیند میں رخصت۔ دوسرا آیا اور مشکل سے پانچ گیند کھیل سکا۔ تیسرا آیا اور پہلے ہی گیند میں کیچ ہو گیا۔ چوتھے نے آکر دو تین معرکے کے ہٹ لگائے مگر جم نہ سکا۔ پانچویں صاحب ہلاک کرنے میں شہر کا جیتے۔ مگر یہاں انکی بھی کچھ نہ چلی۔ تھاپی رکھتے ہی رکھتے غائب ہو گئے۔

اب پرتاپ چندر متانت سے قدم اٹھاتا۔ بیٹ لکھتا میدان میں آیا۔ طرفین نے تالیاں بجائیں۔ الرابادیوں کی کیفیت بیان میں نہیں آسکتی۔ ہر شخص کی نگاہیں پرتاپ چندر کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ سب کے دل دھڑ دھڑ کر رہے تھے چو طرف سناٹا چھایا ہوا تھا کچھ لوگ دور بیٹھے ہوئے خدا سے دعا کر رہے تھے کہ پرتاپ سرخرو لوٹے۔ دیوی اور دیوتا یاد کئے جا رہے تھے۔ پہلا گیند آیا۔ پرتاپ نے خالی دیا۔ الرابادیوں کے دل اچھ بھر بیٹھ گئے۔ دوسرا گیند آیا۔ وہ بھی خالی گیا۔ الرابادیوں کے دل نات تک پہنچ گئے۔ بہت سے آدمی چھتری سنبھال گھر کی طرف چلے۔ تیسرا گیند آیا۔ ایک پٹانے کی آواز ہوئی۔ اور گیند شباب نقاب کی طرح آسمان کو چیرتا ہوا سٹ پر کھڑے ہونے والے فیلڈر سے سو گز کے فاصلے پر گرا۔ الرابادیوں نے تالیاں بجائیں۔ سو کھے دھان میں پانی پڑا۔ جانورالے ٹھٹھک گئے۔ مایوسوں نے بیٹھ سیدھی کی۔ دوسرا گیند آیا۔ اور پہلے والے گیند سے دس گز آگے گرا۔ فیلڈر چونکے۔ ہٹ پر کھک پہنچائی۔ پانچواں گیند آیا اور کٹ پر گیا اتنے میں اوپر ہوا بولر بولے۔ یہ نئے بولر پورے قاتل تھے۔ مملک گیند پھینکتے تھے۔ مگر انکے پہلے ہی گیند کو پرتاپ نے صحیح سے بات کرنے کے لئے آسمان کی طرف بھیج دیا۔ پھر تو گیند اور اُسکی تھاپی میں ہنر سی ہو گئی۔ گیند آتا۔ اور تھاپی سے بنگلہ ہو کر کبھی پورب کی راہ لیتا۔ کبھی عجم کی کبھی اتر کی۔ کبھی دکھن کی۔ فیلڈروں کا دوڑتے دوڑتے ناک میں دم تھا۔ الرابادوالے اچھلتے تھے بغلیں بجاتے تھے لٹپیاں ہوا میں اچھل رہی تھیں۔ ایک صاحب نے روپے نکال کر اٹھادیئے۔ دوسرے صاحب نے اپنی سنہری زنجیر لٹادی۔ حریت دل میں جلتے بھجھلاتے۔ کبھی میدان کی ترتیب بدلتے کبھی بولر تبدیل کرتے۔ مگر سب تدبیریں اور چالیں بے اثر ہو رہی تھیں گیند کا تھاپی سے بار بار ہو گیا تھا۔

کامل دو گھنٹوں تک پرتاپ پٹانے۔ اور بگولے اور ہوائیاں چھوڑتا رہا۔ اور فیلڈر گیند کی طرف یوں لپکتے جیسے بچے چاند کی طرف لپکتے ہیں۔ رنوں کی تعداد تین سو تک پہنچ گئی۔ حریروں کے پچھلے چھوڑے۔ ایسے حواس بائنتہ ہو رہے تھے کہ ایک گیند بھی سیدھا نہ آتا تھا۔ فیلڈ میں بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ پرتاپ نے پچاس رن اور کئے۔ اور اب اُسے امپائر سے ذرا دم لینے کی مہلت مانگی۔ اُسے آتے دیکھ کر ہزاروں آدمی اُسکی طرف لپکے۔ اور اُسے باری باری سے گود میں اٹھانے لگے۔ ہارو نظر نہ بھگدے۔ مچکنی۔ سیکڑوں چھاتے۔ چھڑیاں۔ ٹوپیاں۔ اور جوتے عالم بالا کی سیر کرنے لگے۔ گویا وہ بھی فرط مسرت سے اچھلے پڑتے تھے۔ عین اُسی وقت تار گھر کا چیر اسی بالکل پر آتا ہوا دکھائی دیا۔ قریب اگر بولا پرتاپ چند کسانام ہے۔ پرتاپ نے چونک کر اُسکی طرف دیکھا۔ اور چیر اسی نے تار کا لغافہ اُسکے ہاتھ میں رکھ دیا۔ پڑھتے ہی پرتاپ کا چہرہ زرد ہو گیا۔ ٹھنڈی سانس لیکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور بولا یارو اب میچ کا فیصلہ تمہارے ہاتھ ہے۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اسی ڈاک سے مکان چلا جاؤ لگا۔

یہ کہہ کر وہ بورڈنگ ہاؤس کی طرف چلا۔ سیکڑوں آدمی پوچھنے لگے کیا ہے کیا ہے لوگوں کے چہرہ پر مردنی چھا گئی۔ مگر اُسے بات کرنے کی کہاں فرصت۔ اُسی وقت ڈیم پر بیٹھا اور بنارس کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستہ بھر اُسکا دل تشویشوں کا جولا لگا دینا رہا۔ بار بار اپنے کو نفرس کرتا کہینے چلتے وقت کیوں نہ اُس سے مل لیا۔ اب نہ جانے ملاقات ہو یا نہ ہو۔ اگر خدا خواستہ اُسکی صورت دیکھنی نہ نصیب ہوئی تو میں بھی مُنہ میں کالک لگا کر کہیں مر رہو گا۔ یہی بات پڑ پڑی کئی بار رویا۔ نوبے شب کو گاڑی بنارس پہنچی۔ اُسپر سے اُترتے تھے ہیں اسوقت

کے مکان کی طرف چلا۔ فرط ملال سے آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اور کلیجہ دھڑک رہا تھا۔ ڈپٹی صاحب کرسی پر سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور کملا ڈاکٹر صاحب کے یہاں جانے کو تیار کھڑا تھا۔ پرتاپ چند رکود کیلئے ہی دوڑ کر لپٹ گیا۔ شیاماچرن نے بھی گلے لگایا اور بولے: ”کیا ابھی سیدھے الہ آباد سے چلے آ رہے ہو؟“

پرتاپ: ”جی ہاں۔ آج اماں کا تار پونچا کہ برجن کی حالت بہت خراب ہے۔ کیا ابھی وہی حالت ہے؟“

شیاماچرن: ”کیا کہوں۔ اور دو تین مہینہ سے روز بروز کمزوری ہوتی جاتی ہے۔ دواؤں کا مطلع اثر نہیں ہوتا۔ دیکھیں ایشور کو کیا منظور ہے۔ ڈاکٹر صاحب تو کہتے تھے تپ دوج۔ مگر حکیم صاحب ضعف جگر بتلاتے ہیں۔“

برجن کو جب سے خبر ملی کہ پرتاپ چند آئے ہوئے ہیں تب سے اُسکے دل میں امید اور ہم کی گھڑ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ کبھی سوچتی کہ گھر آئے ہونگے۔ چچی نے زبردستی ٹھیل ٹھال کر یہاں بھیج دیا ہو گا۔ پھر خیال ہوا شاید میری بیماری کی خبر پائی ہو۔ گمبھار کر چلے آئے ہوں۔ مگر نہیں۔ آنکھیں میری ایسی کیا فکر پڑی ہے۔ سوچا ہو گا کہیں مرنے جائے۔ لاؤ چلو دنیا کا بڑا

لو کر تاؤں۔ آنکھیں میرے مرنے جیسے کا کیا غم۔ آج میں بھی حضرت سے جی کھول کر باتیں کر دوں گی۔ لیکن نہیں باتوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ انھوں نے چپ سا دھبی ہے تو میں کیوں بولوں۔ پس اتنا کہہ دوں گی کہ بہت اچھی طرح ہوں اور تمہاری خیریت کی دعا کرتی رہتی ہوں۔ پھر زبان نہ کھولوں گی۔ اور میں یہ کہہ کر پھیل پھیل کر بیٹھی ہوں۔ جو اپنا ہمدرد

نڑیہ کے آگے یہ صورت بنائے رکھنے سے فائدہ۔ وہ ہمان کی طرح آئے ہیں۔ میں بھی کھانسی سے وار آنے پریش آؤں گی۔ انسان کا دل کیسا پیچیدہ ہے! جس شخص کی سرد مہی کے

ہر گم جہد آن اف نہ نگاروں
۹۴ میں سے ہر جنگ نام اک ہم

خیال نے برجن کی یگت بنا رکھی تھی۔ اُسی شخص کو ملانے کے لئے اپنے ایسے منصوبے
باندھ رہی ہے۔
اُنکھوں پر گن کے ہیں

دس بجے کا وقت تھا۔ مادھوی بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ دواؤں کی شیشیاں
اودھڑا دھر پڑی ہوئی تھیں۔ اور برجن چار پائی پر پڑی یہی سب باتیں سوچ رہی تھی۔ کہ
کہ پرتاپ کمرہ میں داخل ہوا۔ مادھوی چونک کر بولی بہن اُٹھو۔ آگے۔ برجن ہک بکا کر
اُٹھی۔ اور چار پائی سے اُترنا چاہتی تھی کہ صنعت کے مارے زمین پر گر پڑی۔ پرتاپ
نے اُسے سنبھالا۔ اور چار پائی پر لٹا دیا۔ آہ! یہ وہی برجن ہے جو آج سے چند ماہ
قبل حُن اور شباب کی مورت تھی۔ جسکے کھڑے پر چمک اور آنکھوں میں ہنسی کا بھیرا
رہتا تھا۔ جسکا بونا شیشیا ما کا گانا۔ اور ہنسانم کا بُھانا تھا۔ وہی سیلی آنکھوں
والی بیٹھی باتوں والی برجن اب ایک تو وہ استخوان ہو گئی ہے۔ پہچانی نہیں جاتی۔ پرتاپ
کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مزاج کی کیفیت پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر منہ سے صرف اتنا
نکلا۔ ”برجن!“ اور آنکھوں سے اشک کے قطرے ٹپکنے لگے۔

محبت کی آنکھیں جذبات کے پر کھنے کی کسوٹی ہیں۔ برجن نے آنکھ اٹھا کر دیکھا
اور اُن چند قطرے اشک نے اُسکے دل کا سب غبار دھو دیا۔

جیسے کسی فوج کا سپہ سالار جو اُسے والی لڑائی کا نقشہ دل میں سوچ رہا غم کو
اپنے پشت پر دیکھ کر بدحواس ہو جاتا ہے۔ اور مجوزہ نقشہ کا خیال بھی اُسے نہیں رہتا۔
اُسی طرح برجن پرتاپ چند رکوا اپنے سامنے دیکھ کر وہ سب باتیں بھول گئی جو وہ ابھی
پڑی پڑی سوچ رہی تھی۔ وہ پرتاپ کو روتے دیکھ کر اپنا سب دکھ بھول گئی۔ اور چار پائی
سے اُٹھ کر اُنکل سے اُسکے آنسو پوچھنے لگی۔ پرتاپ جسے خطا وار کہہ سکتے ہیں اس وقت

مظلوم کی حیثیت میں تھا۔ اور برجن جنے اپنے تئیں گھلا گھلا کر اس حالت کو پہونچا دیا تھا
 رد و کر اُس سے کہ رہی تھی۔ لٹو چپ رہو۔ الشور جانتا ہے میں بالکل اچھی ہوں۔
 گویا اچھا ہونا اسکی خطا تھی۔ عورتوں کے احساسات کیسے نازک ہوتے ہیں۔ پرتاپ کی
 ایک ذرا سی سہل انگاری نے برجن کو اس زندگی سے لاپرواہ بنا دیا تھا۔ اور آج اُنسو کی
 چند بوندوں نے اُسکے دل کی وہ جلن۔ وہ سوز و آگ۔ بھجادی جو کئی مہینوں سے لُسکے
 خون اور جگر کو جلا ہی تھی۔

جو مرنے بڑے بڑے حکیموں اور ڈاکٹروں کے علاج سے دور نہوا سے اُنسو کے
 چند قطروں نے دمِ زندن میں دور کر دیا۔ کیا یہ پانی کے قطرے امرت کی بوند تھیں؟
 پرتاپ نے ضبط کر کے پوچھا ”برجن! یہ تم نے اپنی کیا گت بنا رکھی ہے؟“
 برجن (مسکاکر) ”یہ گت مینے نہیں بنائی۔ تم نے بنائی ہے۔“
 پرتاپ ”آماں کا تار نہ پہونچتا تو مجھے اطلاع بھی نہوتی۔“
 برجن ”ضرورت کیا تھی جسے بھلانے کے لئے الہ آباد چلے گئے اُسکے مرنے مینے کی تمہیں
 کیا پروا؟“

پرتاپ ”باتیں بنا ہی ہو غیر ورنہ کوئی خط لکھتیں؟“
 برجن ”کے اُمید تھی کہ تم اتنی دور سے آئیں گی یا خط لکھنے کی زحمت اُٹھاؤ گے۔ جو دروازہ
 سے آکر پھر جائے۔ اور صورت دیکھنے تک کارواں نہوا سنے خط بھیج کر کہہ کر تے۔“
 پرتاپ ”اُسوقت لوٹ جائیگا جتنا صدرہ مجھے ہوا میرا دل ہی جانتا ہے۔ تم نے نہ وقت
 تک میرے پاس کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ مینے سمجھا اب یاد دل سے جاتی رہی۔“
 برجن ”اگر میں تمہاری باتوں پر اعتبار کرنے کی عادی نہوتی تو اسوقت کد بتی رہت۔“

سوچی ہوئی باتیں ہیں“
 پرتاپؔ: خیر جیسا سمجھو۔ اب یہ بتاؤ کہ طبیعت کی کیا کیفیت ہے میں نے تمہیں پہچانا
 نہیں۔ ایسا چہرہ اتر گیا ہے۔
 برجہنؔ: اب ابھی ہو جاؤنگی۔ دوا ملگئی۔“

پرتاپؔ کنا یہ سمجھ گیا افسوس! میری ذرا سی غلطی نے یہ قیامت ڈھادی۔ دیر تک
 اُسے سمجھاتا رہا۔ اور علی الصبح جب وہ اپنے گھر چلا تو برجہن کا چہرہ کچلا ہوا تھا۔ اُسے یقین
 ہو گیا کہ لڑکھے بھوئے نہیں ہیں۔ اور میری یاد اور عزت اُنکے دل میں قائم ہے۔ پرتاپ
 نے اُسکے جگر سے وہ کاٹا نچال دیا جو کئی مہینوں سے کھٹک رہا تھا۔ اور جتنے اُسکی یہ حالت
 کر دی تھی۔ ایک ہی ہفتہ میں اُسکا کھڑا کندن کی طرح دکنے لگا۔ گویا کبھی بیمار ہی نہ تھی۔

سترھویں فصل

فرض کی حیرت اور محبت کی ہمار

مریض جب تک بیمار رہتا ہے اُسے خبر نہیں ہوتی کہ کون میری تیمارداری کر رہا ہے کون میری عیادت کیلئے آتا ہے
 وہ اپنی ہی تکلیفوں میں اسقدر محو رہتا ہے کہ کسی دوسری بات کا خیال ہی اُسکے دل میں
 پیدا نہیں ہوتا۔ مگر جب اُسے صحت ہو جاتی ہے تو اپنے تیمار دار و دکنی تو جہ اور پریشانی سرخ
 اور جانفشانی کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ اور اُسکے دل میں اُنکی محبت اور عزت زیادہ
 ہو جاتی ہے۔ بعینہ یہی حال برجہنؔ کی رانی کا تھا۔ جب تک وہ خود آزار دل پہ مبتلا تھی کلاچنؔ

کی چیز انہیں اور پریشانیوں کا اندازہ نہ لگا سکتی تھی۔ اسیں شک نہیں کہ وہ اسکی خاطر دیا
 میں کوئی بات اٹھا رکھتی مگر یہ غلط داریاں ایک فرنی انتقام کے خیال سے ہوتی تھیں۔ نہ کہ
 سچی محبت سے۔ لیکن جب اُسکے جگر سے غم کا کاٹا نخل گیا تو کھلا کی دوا و دوش اور
 مرگہ دانیایاں یاد آئیں۔ اور یہ فکر پیدا ہوئی کہ ان عنایات بیکراں کا جواب کیونکر دوں۔ میرا
 دھرم تھا کہ اپنی ذات سے انھیں آرام پہنچاتی۔ مگر آرام کا تو کیا ذکر۔ میں تو اُلٹے انکی
 جان کا گاہک ہوئی ہوں۔ وہ تو ایسے سچے دل سے میری محبت کریں۔ اور میں اپنے
 قزایں بھی دادا کر سکوں۔ ایشور کو کیا منہ دکھاؤنگی۔ سچی محبت کا کنول بسا اوقات
 احسان کے اثر سے کھل جایا کرتا ہے۔ جہاں حسن و شباب۔ دولت و جاہ۔ اور محبان
 ذاتی محبت کا بیج بونے میں ناکام رہتے ہیں۔ وہاں اکثر احسان کا جادو پل جاتا ہے۔
 کوئی دل ایسا سخت اور سرد نہیں ہو سکتا جو سچی خدمت کے احسان سے پھل نہ جلاے۔
 کھلا اور برت رانی میں روز بروز اخلاص اور پیار بڑھنے لگا۔ ایک بندہ محبت کا
 اور دوسری کنیز فرض۔ ممکن نہ تھا کہ برج رانی کی زبان سے کوئی بات نکلے۔ اور کھلاچر
 اُسکے پورے کرنے کی دل و جان سے کوشش کرے۔ اب اُسکی محنت اور لیاقت انھیں
 کوششوں میں مرت ہوتی تھی۔ پڑھنا صرف والدین کو دھوکہ دینے کا ایک وسیلہ
 تھا۔ وہ ہمیشہ اُسکی طبیعت کا رنگ پر کھتا رہتا۔ اور اس اُسید پر کہ یہ کام انکی خوشی کا باعث
 ہو گا وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ ایک روز اُسے ماوصوی کو پھلوڑی میں پھول پھٹنے
 دیکھا۔ یہ پھوٹا سا باغچہ مکان کے پشت پر واقع تھا۔ مگر چونکہ کنبہ کے کسی فرد کو
 اُس سے دلی ہمدردی نہ تھی۔ اسلئے بارھوں مہینے اُسپر غزاں کا دور رہتا تھا۔
 برج رانی کو ببولوں سے خلق محبت تھی۔ پھلوڑی کی یہ درگت دیکھی تو ماوصوی کی

تاکید کی کہ کبھی کبھی اس میں پانی دیدیا کرو۔ رفتہ رفتہ باغچہ کی حالت کچھ کچھ سنبھل چلی۔ اور بعض بعض پودھوں میں پھول نظر آنے لگے۔ کھلا چرن کے لئے اتنا اشارہ کافی تھا۔ دل و جان سے باغچہ کے سوزار نے پرتل گیا۔ دو ہوشیار مالی نوکر رکھ لئے۔ قسم قسم کے خوش رنگ پھول اور پودے لگائے جانے لگے۔ انواع و اقسام کی گھاسیں اور پتیاں گلوں میں سجائی جانے لگیں۔ چمن اور دشنیں درست ہونے لگیں۔ جا بجا تائیں چڑھا دی گئیں۔ کھلا چرن کے دن کتاب ہاتھ میں لئے باغچہ میں ٹھٹھا رہتا اور مایوں سے باغچہ کی بناوٹ اور سجاوٹ کی تاکید کرتا رہتا۔ اور صرف اسکے کہ برجن خوش ہو گئی۔ ایسے بندہ رضا کا جاڑ کسپر نہ چل جائیگا۔ ایک روز کھلانے کہا آؤ تمہیں باغچہ کی سیر کراؤں۔ برج رانی تیار ہو گئی۔

چاند نکل آیا تھا۔ اور اُسکی زرد روشنی میں پھول اور پودے بہت سہانے معلوم ہوتے تھے۔ دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی اور موتے اور بیلے کی لپٹیں دماغ کو مہر کئے دیتی تھیں۔ ایسے وقت میں برجن ایک ملگجی ریشمی ساڑھی اور ایک نفیس مخملی سیلیر پہنے ریل میں ٹھٹھتی نظر آئی۔ اُسکے چروں کی ملاحست پھولوں کو شرمندہ کر رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ پھول کی دیوی ہے۔ کھلا چرن بولے آج محنت سنبھل ہو گئی۔

جیسے قہقہے میں گلال بھرا ہوتا ہے۔ اُسی طرح برج رانی کی آنکھوں میں محبت کا

رس بھرا ہوا تھا۔ وہ مسکرائی مگر زبان سے کچھ نہ بولی۔

کہلا ”مجھ جیسا خوش نصیب آدمی دنیا میں نہ ہوگا“

برجن ”کیا مجھ سے بھی زیادہ؟“

کہلا متوالا ہو رہا تھا۔ برجن کو پیار سے گلے لگایا۔

کچھ دنوں تک روزانہ یہی معمول رہا۔ اسی اثنا میں تازہ دھوپوں کے سامان پیدا ہو گئے۔ رادھا چرن نے تصویر و لٹا ایک خوبصورت البم برجن کے پاس بھیجا۔ اس میں کئی تصویریں چندر کی بھی تھیں کہیں وہ میٹھی سٹیا کو پڑھا رہی ہے۔ کہیں میٹھی ہوئی خط لکھ رہی ہے۔ اسکی ایک تصویر مردانہ لباس میں بھی تھی۔ رادھا چرن فوٹو گرافی کے فن سے واقف تھے۔ برجن نے یہ البم بہت پسند کیا۔ پھر کیا تھا کملا کو دھن سوار ہوئی کہ میں بھی تصویر کشی میں مہارت حاصل کروں۔ اور برجن کی تصویر کھینچوں۔ بھائی کے پاس لکھ بھیجا کہ کیرا اور دوسرے ضروری سامان میرے پاس بھیج دیجئے۔ اور مشق شروع کر دی۔ گھر سے چلتے کہ مدرسے جا رہا ہوں۔ اور بیچ میں ایک پارسی فوٹو گرافر کی دوکان پر آ بیٹھے۔ تین چار مہینہ کی محنت اور کوشش میں اس فن سے پوری واقفیت ہو گئی۔ مگر ابھی تک گھر پر کسی کو یہ راز معلوم نہ تھا۔ کئی ماہ برجن نے پوچھا بھی کہ آجکل دن بھر کہاں غائب رہتے ہو۔ تعطیل کے دن بھی نہیں نظر آتے۔ مگر کملا چرن نے ہوں ہاں کر کے ٹال دیا۔

ایک روز کملا چرن کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ برجن کے جی میں آئی لاؤ پڑا چاند کو ایک خط لکھ ڈالوں۔ مگر صندوق کھولا تو چٹھی کا کاغذ نہ ارد۔ مادھوی سے کہا جا کر اپنے بھیا کے ڈسک میں سے ٹیڑھا سا کاغذ نکال لا۔ مادھوی دوڑی ہوئی گئی تو اُسے ڈسک سے تصویروں کا البم کھلا ہوا ملا۔ اُس نے البم اٹھا لیا اور اندر آکر برجن سے بولی ”بھن دیکھو یہ تصویر ملی“

برجن نے اُسے شوق سے ہاتھ میں لے لیا۔ اور پہلا ہی ورق اٹا تھا کہ اچنبھا سا ہو گیا۔ وہ اسیکی تصویر تھی۔ وہ اپنی پلنگ پر چادر اوڑھے۔ منہ میں مست پڑی تھی۔

بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور ایک ایک حصہ سے بے تکلفی ٹپکتی تھی جو ٹوپی پر ایک دلپذیر مسکراہٹ کا جلوہ تھا۔ گویا کوئی دلچند خواب دیکھ رہی ہے۔ تصویر کے نیچے جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ ”مخواب ناز“۔ بہر جن حیرت میں تھی کہ میری ایسی تصویر انھوں نے کیسے کھینچوائی۔ اور کس سے کھینچوائی۔ کیا کسی فولگرافر کو اندر لائے ہونگے۔ نہیں ایسی شہرارت بھلا کیا کریں گے۔ کیا تعجب ہے خود ہی سیکھ لیا ہو۔ ادھر مہینوں سے بہت مشغول بھی تو ہیں۔ اگر خود ایسی عمدہ تصویر کھینچی ہے تو واقعی قابل تعریف کام کیا ہے۔ دوسرا ورق اُلٹا تو وہ بھی اپنی ہی تصویر۔ وہ ایک ساڑھی پہنے بے تکلفی سے آدھے سرتک انچل ڈالے۔ سیرچمن میں معروف تھی۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ ”سیر باغ“۔ تیسرا ورق اُلٹا تو وہ بھی اپنی ہی تصویر تھی۔ وہ باغچہ میں زمیں پر بیٹھی ہانگوندھ رہی ہے۔ ڈھیروں پھول ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں۔ اور مادھوی دوڑ دوڑ پھول چن رہی ہے۔ یہ تصویر تینوں سے زیادہ خوبصورت تھی۔ کیونکہ مقصور نے اس میں بڑی صفائی سے قدرتی رنگ بھرے تھے۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا ”ایللی مالن“ اب بہر جن کو خیال آیا۔ کہ ایک روز جب میں ہانگوندھ رہی تھی تو کلاچرن نیل کانٹے کی جھاڑی سے مسکراتے ہوئے نکلے تھے۔ ضرور اُسی دن یہ تصویر کھینچی ہوگی۔ جو تھادرق الٹا تو ایک نہایت لطیف اور دلکش منظر دکھائی دیا۔ ایک شفاف پانی کا چشمہ تھا۔ اور اُسکے دونوں کناروں پر جہانک گاہ پہنچتی تھی۔ گلاب کے تختے نظر آتے تھے۔ اُنکے نازک پھول ہوا کے جھونکوں سے چکے جاتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا قدرت نے سبز آسمان میں سُرخ ستارے ٹپکانک دئے ہیں۔ یہ کسی انگریزی تصویر کی نقل معلوم ہوتی تھی۔ البم کے اور صفحے ابھی سادہ تھے۔

برجن نے اپنی تصویریں دوبارہ دیکھیں۔ اور اُس نخوت آمیز مسرت کے ساتھ جو ہر
پری پیکر کو اپنے حُسن پر ہوتی ہے البم کو چھپا کر رکھ دیا۔ شام کو کملا چرن نے اگر دیکھا
تو تصویریں غائب تھیں۔ ہوش اُڑ گئے۔ وہ اُسکے کئی مہینہ کی جگہ کا ویکٹریز تھیں۔
اور اُسے اُمید تھی کہ البم تحفہ میں دیکر برجن کے دیدہ و دل میں اور بھی گھر کر لوں گا۔ بہت
پریشان ہوا۔ اندر جا کر برجن سے دریافت کیا تو اُس نے صاف انکار کر دیا۔ بیچارہ گھبرا ہوا
اپنے دوستوں کے گھر گیا کہ شاید اُنہیں سے کوئی اُٹھا لیا ہو۔ مگر وہاں بھی جبر پھیتوں کے
اور کچھ ہاتھ نہ لگا۔ آخر جب حضرت بہت زچ ہو گئے تو شام کے وقت برجن نے البم کا پتہ
بتلایا۔ اسی طرح دن لُطف سے گزر رہے تھے۔ آپس میں چھڑچھاڑ اور مزے مزے کی باتیں
ہوتی رہتی تھیں۔ دو دنوں کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ میدان الفت میں میں اُسے غل
جاؤں۔ مگر دونوں کی محبتوں میں فرق تھا۔ کملا چرن غلبہ محبت میں اپنے کو بالکل بھول گیا تھا۔
برعکس اسکے برجن کی محبت فرض کی بنیاد پر قائم تھی۔ ہاں یہ خوشگوار فرض تھا۔
جسے محبت کی چاشنی نے بہت پُر لذت بنا دیا تھا۔

تین سال اور گزر گئے۔ یہ اُنکی زندگی کے تین مبارک سال تھے۔ چوتھے سال کا
آغاز آیام مصیبت کی ابتدا تھی بعض ہستیوں کو قدرت کی جانب سے دنیا کی نعمتیں اور کامرانیان
لے کر کس بہتات سے ملتی ہیں کہ اُنکے لئے دن سدا ہولی۔ اور رات سدا دیوالی بنتی ہے مگر کتنی ہی
ایسی بد قسمت ہستیاں بھی ہیں جن کا بیاں سرسرت چھوٹا اور چھچھلا ہوتا ہے۔ ایسا چھوٹا کہ
آنکھوں میں نشہ کی سُرخ آنے سے پہلے ہی جام خالی ہو جاتا ہے۔ اور مسرت کے چند
لمحے زندگی کی سیاہ گھاٹی میں ایک بار بھلی کی طرح کو نہ کر ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ جاتے
ہیں۔ ہرج رافی انھیں بد قسمتوں میں تھی۔ بسنت کی رُت تھی۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔

سردی اس غضب کی پڑتی تھی کہ کنوؤں کا پانی جم جاتا تھا۔ اس وقت شہر میں طاعون کا دورہ ہوا۔ ہزاروں آدمی اُسکی نذر ہوئے لگے۔ ایک روز شدت کا بخار آیا۔ ایک گھٹی نخلی۔ اور مریض راہی عدم ہو گیا۔ گلچ کا نخلنا گویا موت کا پروانہ تھا۔ کیا حکم۔ کیا ڈاکٹر۔ کسی کا علاج کارگر نہیں ہوتا تھا۔ سیکڑوں گھر بے چراغ ہو گئے۔ ہزاروں بچے یتیم۔ اور ہزاروں عہتیں بیوہ ہو گئیں۔ جسکے جد مر سینگ سائے اوھر بھاگ نکلا۔ ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ کوئی کسی کا ہمدرد اور غمخوار نہ تھا۔ والدین بچوں کو چھوڑ کر بھاگے۔ عورتیں مردوں سے کنارہ کش ہو گئیں۔ گلیوں میں۔ سڑکوں پر۔ مکانوں میں۔ جد مر دیکھے لاشوں کے انہار لگے ہوئے تھے۔ دوکانیں بند ہو گئیں۔ دروازوں میں قفل پڑ گئے۔ جو طرف خاک اڑتی تھی۔ مشکل سے کوئی جاندار چلتا پھرتا دکھائی دیتا تھا۔ اور اگر کوئی ضرورت سے مجبور ہو کر گھر سے نکل پڑا تو وہ ایسی تیزی سے قدم اٹھاتا تھا گویا موت کا سپاہی اُسکے تعاقب میں ہے۔ ساری سببی ویران ہو گئی۔ اگر آباد تھا تو قبرستان۔ یا شہرستان۔ چوروں اور رہزنوں کی بن آئی۔ دن و معاڑے قفل لٹختے۔ اور آفتاب کی روشنی میں سیندیں پڑتی تھیں۔ جو لوگ طاعون سے بچے اُنھیں فاقوں نے آدو بچا۔ فرض عجیب مصیبت کا سامنا تھا۔

بابوشیا ماچرن بہت مضبوط دل کے آدمی تھے۔ مکان کے چاروں طرف محلے کے محلے خالی ہو گئے تھے۔ مگر وہ ابھی تک اپنے مکان میں بیوقوف و خطر آباد تھے۔ مگر جب انکا ایک سائیں مر گیا تو سارے کنبے میں کھلبلی پڑ گئی۔ اور دیہات چلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ منشی جی نے اسی ضلع میں چند گائوں خرید لئے تھے۔ اور جنگال نامی ایک موضع میں ایک وسیع مکان بنوا رکھا تھا۔ انکا ارادہ تھا کہ کمپنیشن پانے پر یہیں

الہ آباد جانے کے لئے زور دی گئی۔ اُسے کیا خبر کہ یہاں دلپر کیا میت رہی ہے کلاش اسکا دل مجھے مل جاتا۔ یوں بات چیت میں تو چند و تلک گھول دیتی ہے۔ مگر جب کبھی محبت کے امتحان کا موقع آ جاتا ہے تو فرمن اور مصلحت کے پردہ میں منہ چھپانے لگتی ہے حق یہ ہے کہ عورتوں میں وفا کی بوہی نہیں ہوتی۔

جب رات زیادہ گزر گئی۔ اور کلا جگہ سے نہ ہلا تو برج رانی خود آئی۔ اور بولی "کیا آج گھر میں جانے کی قسم کھالی ہے۔ راستہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھر لگیں" کلا۔ "اندر جا بے ڈر معلوم ہوتا ہے"

برجن بڑا بچا چلوں ساتھ ساتھ چلتی ہوں۔ اب تو نہ ڈر دے گا

کلا۔ "مجھے الہ آباد جانے کے لئے حکم ہوا ہے"

برجن۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی"

یہ لکڑ برجن نے کلا کی طرف آنکھیں اٹھائیں۔ انہیں انگو کے خوشے لگے ہوئے تھے۔ کلا ہار گیا۔ ان موہنی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کلا جگر تھا جو اپنی ضد پر قائم ہے۔ کلا نے اُسے گلے لگایا اور بولے میں جاتا تھا کہ تم جیت جاؤ گی۔ اسی لئے اندر نہ جاتا تھا۔

ساری رات محبت کی الوداعی باتیں ہوتی رہیں۔ بار بار محبت کی نگاہیں ہم آغوش ہوتیں گویا وہ پھر کبھی نہ ملیگی۔ افسوس! یہ جہانی آخری ملاقات تھی۔ برجن نے پھر کلا کی صورت نہ دیکھی۔ وہ کیا جانتی تھی کہ قسمت ہمیں یہ فیض کے لئے جدا کر رہی ہے۔



اٹھا رہویں فصل

برجن کے خطوط کلا کے نام

— + —

(۱)

پیارے محبت نامہ آیا۔ سر اور آنکھوں سے لگایا۔ ایسے خط تم نہ لکھا کرو کیجیو
پاش پاش ہو جاتا ہے۔ میں لکھوں تو مضائقہ نہیں۔ یہاں طبیعت سخت گھبراہٹ ہے
کیا سنتی تھی اور کیا دیکھتی ہوں۔ ٹوٹے پھوٹے پھونس کے جھونپڑے۔ ایک ایک
بالشت کی بوسیدہ دیواریں۔ گھروں کے سامنے کوڑے کرکٹ کے بڑے بڑے ڈھیر
کیچڑ میں لپٹی ہوئی سوریں۔ بولی بولی مرل گائیں۔ یہ سب نظارہ دیکھ کر جی چاہتا ہے
کہیں چلی جاؤں۔ اومیو کو دیکھو تو سخت حال۔ ہڈیاں ٹخلی ہوئی۔ پریشانی کی مورت۔
افلاس کی زندہ تصویر کسی کے بدن پر ثابت پڑا نہیں۔ کیسے قسمت کے کھولے۔ کہ
رات دن پسینہ بہانے پر بھی کبھی بھر پیٹ روٹیاں نصیب نہوں۔ خیر ہمارے مکان کے
بچھوڑے ایک چھوٹی سی گڑھیا ہے۔ مادھوی کہلاتی تھی۔ پیر پھلا تو پانی میں گر پڑی۔
یہاں مشہور ہے کہ اس گڑھیا میں چڑھیں نہانے آیا کرتی ہیں۔ اور وہ خواہ مخواہ راہ
چلتوں کو چھیڑتی ہیں۔ اسی طرح دروازہ پر لکٹیل کا ساورہ سخت ہے۔ وہ بھوتوں کا بیڑا ہے۔
پہل کے بمودوں اور گڑھیا کی پڑیلوں میں بہت راہ ورسم ہے۔ گڑھیا کا تو خیر بہت
خوف نہیں مگر اس کہنوت پہل کا خوف سارے گائوں کے دل کو پھرایا پھایا ہوا ہے کہ

کلمہ مرثام ہی سے راستہ بند ہو جاتا ہے۔ لڑکے اور عورتیں تو اُدھر قدم ہی نہیں رکھتیں۔ ہاں لڑکاؤں کا کدو کبھی کبھی گزر جاتا ہے۔ مگر وہ بھی گھبراہٹ ہوا ہوا دیکھ کر دو مقام تو گویا ان پلید و حوں کے مرکز ہیں۔ ان کے علاوہ صد ہا بھوت پڑیل مختلف مقامات میں آباد پائے جاتے ہیں۔ معتبر داستانیں ہیں کہ پڑیل میں نظر آتی ہیں۔ گانوں والوں نے ان کے مزاج پہچان سکے ہیں۔ کسی بھوت کی نسبت کیا جاتا ہے کہ وہ سر چڑھتا ہے تو مینٹاں تک پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اور کوئی وہ ایک دن میں پوچھا کیا رنگ ہو جاتا ہے گانوں والوں نے ان امور پر اس طرح باتیں ہوتی ہیں۔ گویا یہ دیکھی راجھتا ہیں یہاں تک کہ گایا ہے کہ پڑیل میں کھانا مانگنے اور پانی لینے آ کر رہتی ہیں۔ انکی سلاخیاں عموماً گنگے کی پر کی طرح صاف ہوتی ہیں۔ اور باتیں کسی قدر ناک میں کرتی ہیں۔ ہاں گنگے کا استعمال انکی قوم میں سلج نہیں۔ انکی زندگی میں آجائے کا خطرہ ان جوان عورتوں کو ہوتا ہے جو بناؤ سنگار کئے۔ رنگیں کپڑے پہنتے۔ اکیلی نظر آجائیں۔ پھولوں کی باس لگو بہت پسند ہے۔ بچال نہیں کہ کوئی عورت یا لڑکا دوپہر کو بارات کو اپنے پاس پھول رکھ کر سوئے۔

بھوتوں کے رتبہ اور اعزاز کا امتیاز ذاتی سے کیا گیا ہے۔ جو کہ بابا آدمی رات کو کالی کر یا اوڑھے۔ کھڑاؤں پر سوار۔ گانوں کے چاروں طرف گھومتے ہیں۔ اور جھونے بچکے مسافروں کو راستہ بتاتے ہیں۔ سال بھر میں ایک بار انکی بد باہوتی ہے۔ وہ اب بجائے بھوتوں کے دیوتاؤں کے زمرہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ کسی رات کو حتیٰ الوسع گانوں کے اندر قدم نہیں رکھتے دیکھتے۔ اسکے برعکس دھوبی یا باسے بچہ پچھترتا ہے۔ جس درخت پر انکی بد و باس ہے اُدھر سے اگر کوئی چراغ جلنے کے بعد نکل جائے تو اسکے جان کی خیر نہیں۔ انھیں بھگاسنے کے لئے دو بوس شراب کافی ہے۔ انکا پلو جاسے۔

کے دن اس درخت کے تلے گانجہ اور چرس رکھ آتا ہے۔ ایک لالہ صاحب بھی بھوت بن بیٹھے ہیں۔ یہ ذات شرین پڑاری تھے۔ انھیں چند ستم زدہ اماہوں نے قتل کر ڈالا تھا۔ انکی پڑوہ بلا کی کپڑ ہے کہ بلا جان لئے بیچا ہیں جھوٹی۔ کوئی پڑاری یہاں سال بہر زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم کو گے کہ یہ کہاں سے بھوت چڑیل کا پچڑاٹے بیٹھی۔ میں کیا کروں۔ گانوں سے ذرا فاصلہ پر ایک درخت ہے۔ اُس پر مولوی صاحب قیام فرماتے ہیں۔ وہ بیچارے کسی کو نہیں چھڑتے۔ ہاں جمعرات کے روز جمعراتی نہ پوچھ جاسے تو بچوں کو ستانے لگتے ہیں۔

کیسی جہالت ہے! کیسی وہم پرستی! یہ خیالات ان لوگوں کے خیمہ ہو گئے ہیں۔ بچہ بیمار ہوا اور بھوت کی پوجا ہونے لگی۔ کھیت کھلیاں میں بھوت کا حصہ۔ شادی بیاہ میں بھوت کا حصہ۔ جہاں دیکھئے بھوت ہی بھوت نظر آتے ہیں۔ یہاں نہ دیوی ہیں۔ نہ دیوتا بھولونا راج ہے۔ جہاں یہاں قدم نہیں رکھ سکتے۔ روہیں بھوت ہی قبض کرتے ہیں۔ ان خیالات کی کیونکر اصلاح ہوگی۔ اور کیا لکھوں۔

تمہاری برجن

(۲)

مہنگاؤں۔

پیارے شکر ہے بعد مدت کے تمہاری پریم پری ملی۔ کیا بیج مچ۔ خط لکھنے کی بھی فرصت نہیں۔ خط کیا لکھا ہے گویا بیگار ٹالی ہے۔ تم میں تو یہ عادت نہ تھی۔ کیا وہاں جا کر کچھ اور ہو گئے۔ تمہیں یہاں سے گئے دو ماہ سے زائد ہوتے ہیں۔ اس درمیان میں کئی چھوٹی بڑی تعطیلاتیں ہیں۔ مگر تم نہ آئے۔ تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں ہولی کی تعطیل میں

حضرت انا الکراکی ترسایا تو مجھے ہمیشہ شکایت رہی گی۔

یہاں اگر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی دوسری دنیا میں آگئی ہوں۔ رات کو سوئی تھی کہ بچا یک ماہا ہو مو کا غل سنانی دیا۔ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ لڑکے گھر گھر سے لکڑی اور اُپلے وصول کرتے پھرتے ہیں۔ ہولی مانا کی یہی خوراک ہے۔ یہ طوفان بے تہیز جہاں پہونچ گیا ایندھن کا ستھرا ہو گیا۔ کسی کی مجال نہیں ہے جو اس فوج کو روک سکے۔ ایک نمبردار کی منڈیا غائب ہو گئی۔ اسمیں دس بارہ بیل آسانی سے بندھ جاتے تھے۔ ہولی والے کئی دن سے تاک میں تھے۔ موقع پا کر اڑا لینگے۔ ایک کڑمی کا جھونپڑا اڑ گیا۔ کتنے ہی اُپلو لاپتہ ہو گئے۔ لوگ اپنی لکڑیاں گھروں میں بھرے لیتے ہیں۔ لالہ جی نے ایک پٹر ایندھن کے لئے مول لیا تھا۔ آج رات کو وہ بھی ہولی مانا کے منہ میں چلا گیا۔ دو تین گھروں کے کوٹڑا اُتر گئے۔ پٹواری صاحب دروازہ پر سو رہے تھے۔ انھیں زمیں پر ڈھکیں کر لوگ چار پانی لے بھاگے۔ جو طرف ایندھن کی لوٹ چھی ہوئی ہے۔ جو چیز ایک بار ہولی مانا کے منہ میں چلی گئی اُسے پھیر لانا پڑا بجاری گناہ ہے۔ پٹواری صاحب نے بڑی دھمکیاں دیں۔ میں معیندی بگاڑ دوں گا۔ خسرہ غلط لکھ دوں گا۔ مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ یہاں کا قانون رسمی ہے کہ اندنوں ہولی والے جو چیز پاجائیں بلا حرامت لے جائیں۔ کون کسی فریاد کرے۔ جو ان بیٹا اپنے باپ کی آنکھ بچا کر اپنی ہی چیز اُٹھو دیتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اپنی جماعت میں ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ فصل تیار ہو گئی ہے۔ مگر کاٹنے میں دو ہفتہ کی کسر ہے۔ میرے دروازہ پر سے میلوٹنا منظور کھائی دیتا ہے۔ گیہوں اور جو کے سترے کھیتوں کے کنارے کنارے کم کے سرنج اور زعفرانی پھولوں کا حاشیہ نہایت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ طوطے چوہے منڈلایا کرتے ہیں۔

مادھوی نے یہاں کئی سکھیاں بنا رکھی ہیں۔ چودس میں ایک ابیر رہتا ہے۔
 رادھا نام ہے۔ پار سال ماں باپ طاعون کے شکار ہو گئے۔ گرھتی کا کل بار اسی کے
 سر پہ ہے۔ اُسکی بیوی تلسا ہمارے یہاں اکثر آتی ہے۔ خوبصورت، نک سگ سے درت
 عورت ہے۔ بات چیت کر سنے میں شرماتی جاتی ہے۔ بھولی اتنی کہ جی چاہتا ہے گھنٹوں
 اسکی بائیں سنا کرے۔ مادھوی نے اس سے بہنا پا کر رکھا ہے کل اُنکی گڑیوں کا بیاہ ہے۔
 تلسی کی گڑیا ہے اور مادھوی کا گڑا سنٹی ہوں بچا پسی بہت غریب ہے۔ مگر بیٹے اُسکے
 پہرے پر کبھی میل نہیں دیکھی۔ کتنی تھی کہ اُسے بچ کر دور وہیہ حج کر لیا ہے۔ ایک روپیہ ہیز
 دیگی۔ اور ایک روپیہ میں براتیوں کا کھانا بنایا ہوگا۔ گڑیا کے گئے کپڑے کا بوجہ رادھا کے
 سر ہے۔ کیسی سادہ قناعت سے بھری ہوئی معاشرت ہے!

لو اب رخصت ہوتی ہوں۔ تمہارا وقت بکواسٹھنے میں ضائع ہوا۔ معاف کرنا۔
 تمہیں نط لکھنے بیٹھتی ہوں تو قلم ہی نہیں رکنا۔ ابھی بہتری باتیں لکھنے کو پڑی ہیں۔
 پر تاپ چند سے میرا پا لائن کدینا۔

تمہاری برجن

(۲۳)

جھگانوں۔

پیارے۔ تمہارا محبت نامہ ملا۔ سینہ سے لگایا۔ خوب اچوری اور سینہ زوری۔
 اپنے ذرا سنے کا الزام میرے سر رکھتے ہو۔ میرے دل سے کوئی پوچھے کہ اُسے تمہارے
 دیدار کی کتنی آرزو ہے۔ اب یہ تمہارا روز بروز اضطراب کی صورت پکڑتی جاتی ہے کبھی کبھی
 بیچیں ہو جاتی ہوں۔ میری یہ حالت تھوڑے ہی دنوں سے ہمسنگی ہے۔ جو وقت بیکار

گئے ہو مجھے معلوم نہ تھا کہ وہاں جا کر میری دلیل کر دو گے۔ خیر تمہیں سچ اور میں ہی جھوٹ۔
 مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تنہا میرے دونوں خطبہ بند کئے۔ مگر پرتاپ چند کو ناحق دکھائے۔
 وہ حالات بالکل قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ غلطیاں رہ گئیں ہوں۔
 مجھے یقین نہیں آتا کہ پرتاپ نے انھیں بہت قیمتی سمجھا اگر وہ میرے خطوط کی اتنی وقعت
 سمجھتے ہیں کہ ان کے سہارے سے ہماری دیہاتی معاشرت پر کوئی دلچسپ مضمون لکھ سکیں تو
 میں انہیں بہت خوش قسمت سمجھتی ہوں۔

کل یہاں دیوبند جی کی پوجا تھی۔ ہل۔ چلی۔ پُر۔ چولے سب بند تھے۔ دیوبند جی کا
 ایسا ہی حکم ہے۔ ان کے حکم کی نافرمانی کون کرے۔ حقہ پانی بند ہو جائے۔ سال بھر میں
 یہی ایک دن ہے جسے گائوں والے بھی تعطیل سمجھتے ہیں۔ ورنہ ہولی دیوالی بھی روز مرہ
 کے ضروری کام نہیں بند کر سکتیں۔ بکرا چڑھا۔ ہون ہوا۔ ستو کھلایا گیا۔ اب گائوں کے
 بچے کو یقین کامل ہے کہ طاعون کا دورہ یہاں نہ ہو سیکے گا۔ یہ سب تماشہ دیکھ کر سوئی تھی۔
 قریب بارہ بجے ہونگے کہ سیکڑوں آدمی ہاتھوں میں شعلیں لئے۔ غل مچاتے نکلے۔ اور
 سارے گائوں کا پھیر کیا۔ جسکے معنی یہ ہیں کہ بیماری اس حد کے اندر قائم نہ کیگی۔
 ملوان کے ختم ہونے پر چند آدمی دوسرے گائوں کے حدود میں گھس گئے۔ اور تھوڑا سا
 پھول۔ پان چاول لونگ وغیرہ چیزیں زمیں پر رکھ دیں۔ یعنی اپنے گائوں کی بلادوسرے
 گائوں میں ڈال دی۔ جب یہ لوگ اپنا کام پورا کر کے چلنے لگے تو اُس گائوں والوں کو
 سن گن ملگئی۔ سیکڑوں آدمی لاٹھی لے لیکر چڑھ دوڑے۔ اور دونوں فریق میں خوب
 مار پیٹ مچی۔ اسوقت گائوں کے کئی آدمی ہل دی پڑ رہے ہیں۔

آج سویرے کل کے بچے کچھے رسوم ادا کئے گئے۔ جسے یہاں کی اصطلاح میں

کڑھائی دینا کتنے ہیں۔ میرے دروازہ پر ایک بھٹا کھودا گیا۔ اور اُس پر ایک کڑواہ دودھ سے لبریز رکھا گیا۔ کاشی نام کا ایک بھر ہے۔ وہ بدن میں بھبوت رمائے آیا۔ گائوں کے آدمی ٹاٹ پر بیٹھے۔ سنکھ بجنے لگا۔ کڑواہ کے چاروں طرف مالا پھول بکیر دیا گیا۔ جب کڑواہ میں خوب اُبال آیا تو کاشی یکا یک اُٹھا اور بے کالی جمی! اکھر کڑواہ میں کود پڑا۔ میں تو سمجھی اب میرا زندہ نہ نکلیں گا۔ مگر باغ منٹ کے بعد کاشی نے پھر جھٹ ماری۔ اور کڑواہ کے باہر تھا۔ اُسکا بال بھی بکھا نہوا۔ لوگوں نے اُسے مالا پہنایا۔ اور ہاتھ بڑھ کر پوچھنے لگے مہراج ابکی سال فصل کیسی ہوگی۔ پانی کیسا برسیگا۔ بیماری آگئی یا نہیں۔ گائوں کے لوگ غیریت سے رہیں گے ہگڑ کا بھاؤ کیسا رہے گا۔ وغیرہ۔ کاشی نے ان سب سوالوں کے جواب صاف صاف مگر ذرا مزید بانہ الفاظ میں دیئے۔ اسکے بعد مجلس برخواست ہوئی۔ سنتی ہوں یہ جیسے ہر سال ہوا کرتے ہیں۔ کاشی کی مشین گولیاں سب سچی ثابت ہوتی ہیں۔ اور کبھی ایک ادھ غلط بھی نکل آئیں تو کاشی اُنکی تاویل بڑی خوبی سے کر دیتا ہے۔ کاشی کو شمیر فتناسی میں بڑا ملکہ ہے۔ گائوں میں کہیں چوری ہو کاشی اسکا پتہ لگا دینگا۔ جو کام پولیس کے بھیدیوں سے پورا نہ ہو اُسے وہ پورا کر دیتا ہے۔ اور گو وہ ذات کا بھر ہے۔ مگر گائوں میں اُسکی بڑی عزت ہے۔ ان سب خدات کا معاوضہ وہ بجز شراب کے ادھ کچھ نہیں لیتا۔ نام نکلوائے مگر ایک بوتل اسکے مذکر کیجئے۔ آپکا مقدمہ کچھری میں ہے۔ کاشی اُسکی فتح کی کوشش میں سرگرم ہے۔ بس اُسے ایک بوتل آبِ مسخ دیجئے۔

ہولی کا زمانہ بہت قریب ہے۔ ایک ہفتہ سے زائد نہیں۔ اب اب میرا دل اسوقت کیسا باغ باغ ہو رہا ہے۔ دل میں مسرت آمیز گدگدی محسوس ہو رہی ہے۔ اکٹھیں تمھیں

دیکھنے کے لئے بیقرار ہو رہی ہیں۔ یہ ہفتہ بڑی مشکوں سے کٹے گا۔ اور تب! میں اپنے
بیاکار دشمن پاؤں گی۔

تمہاری پیاری بربن

(۴)

مجگانوں۔

پیارے! تم ظالم ہو۔ سنگدل ہو۔ بی وفا ہو۔ بیرحم ہو۔ بے درد ہو۔ جھوٹے ہو۔
اور میں تمہیں کیا گالیاں دوں۔ اور کیا کوسوں کا شتم اس وقت میرے سامنے ہوتے
تو اس سنگدلی کا جواب دیتی۔ میں کہہ رہی ہوں۔ تم دغا باز ہو۔ میرا کیا کر لو گے۔ نہیں آئے ہو
مست آؤ۔ اگر میری صورت سے بیزار ہو بہتر۔ اگر میری جان لینے پر آئے ہو شوق سے لیلو۔
رلاتا منظور ہے رلاؤ۔ مگر میں روں کیوں۔ میری بلارو پیسے۔ جب آپ کو اتنا خیال نہیں
کہ دو گھنٹہ کا سفر ہے ذرا آسکی خبر لیتا آؤں۔ تو مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ روں۔ اور
جان کھوؤں۔

ایسا غصہ آ رہا ہے کہ خط چاک کر کے پھینک دوں۔ اور پھر تم سے بات نہ کروں۔
ہاے! تم نے میرے ارمان کیسے خاک میں ملائے ہیں۔ ہولی! ہولی! اس ایک لفظ
میں میرے لئے جادو کا اثر تھا۔ کسی کے زبان سے نکلا اور میرے دل نے گدگدانا
شروع کیا۔ مگر فوس! ہولی گزر گئی۔ اور میں ناکام اور نامراد رہ گئی۔ پہلے یہ لفظ منکر
دل میں گدگدایا ہوتا تھی۔ اب کلیجہ موستا ہے! اپنی اپنی قسمت ہے۔ گالوں کے بھوکے
ننگے لنگوٹی میں پھاگ کھیلے۔ خوشیاں منائیں۔ رنگ اڑائیں۔ اور میں جو گنی اپنی جا رہی
پر سفید ساری پہنے پڑی رہوں۔ قسم لے لو جو آپر ایک سرخ دھبہ بھی پڑا ہو۔ قسم لے لو

جو میں نے عبیر یا گلال ہاتھ سے چھوا ہو۔ میری عطر میں بسی ہوئی عبیر۔ کپڑے میں گھولی ہوئی گلال۔ تکلف سے بناے ہوئے پان۔ سب تمہاری بے مہری کار و نا سو رہے ہیں۔ مادھوی نے جب بہت ہٹ کی تو میں نے ایک سُرخی ٹیکہ لگوایا۔ مگر آج سے ان شکایتوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اگر پھر کوئی کڑھکا رت زبان سے نکلے تو زبان کاٹ لینا۔

پرسوں سرخام ہی سے گالوں میں جہل پہل مچنے لگی۔ تو جوانوں کی ایک جماعت ہاتھ میں دن لے گالی۔ مغلطات کہتی دروازے دروازے پھیرے لگانے لگی۔ مجھے نہ معلوم تھا کہ آج یہاں اتنی گالیاں کھانی پڑیں گی۔ شرمناک الفاظ اُنکے منہ سے ایسے بے تکلف نکلتے ہیں جیسے بھول جھڑتے ہوں۔ خرم و لحاظ کا نام نہ تھا۔ باپ بیٹے کے منہ پر بیٹا باپ کے سامنے گالیاں بک رہا ہے۔ باپ لٹکا کر بہو سے کہتا ہے آج ہولی ہے۔ بہو گھر میں سر نہ بچا کئے سنتی ہے۔ اور مسکرا دیتی ہے۔ ہمارے پٹواری صاحب تو ایک ہی صفت نکلے۔ آپ شراب میں مخمور۔ نشہ میں چور۔ ایک میلی سی ٹوپی سر پر رکھے اس جماعت کے پیشرو تھے۔ اُنکی بہو بھیاں بھی اُنکے مغلطات کی طعنائی سے بچ نہ سکیں۔ گالیاں کھاؤ۔ اور حنفو۔ اگر چہرے پر ذرا بھی میل آئے تو لوگ سمجھیں اسکی محرم کی بیداریش ہے۔ خوب رواج ہے!

تین بجے شب کے قریب یہ جماعت ہولی ماتا کے پاس پہنچی۔ لڑکے آتش بازیں چھوڑ رہے تھے۔ میں بھی کچی عورتوں کے ساتھ گئی۔ وہاں عورتیں ایک طرف ہولیاں لگای تھیں۔ آخر ہولی میں آگ لگایا وقت آیا۔ آگ لگتے ہی دم کی دم میں شعلے بلند ہوئے۔ اب اہر ملدا آسمان سُنہرے رنگ میں رنگ گیا۔ دور دور تک کے پیڑ پتے سنور ہو گئے۔ اب اس آتش کہہ کے چاروں طرف لوگ ہولی ماتا کی جے جلا جلا کر دوڑنے لگے۔ سہو نیکے

ہاتھوں میں گئیوں اور جو کی بالیاں تھیں۔ جو وہ اس الاؤ میں پھینکتے جاتے تھے۔ جب شعلے بہت بلند ہو گئے تو لوگ ایک کنارے کھڑے ہو کر پھر کبیر کہنے لگے۔ دو گھنٹہ تک یہی کیفیت رہی۔ لکڑی کے کندول سے چٹاخ چٹاخ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ مویشی اپنے اپنے کھونٹوں پر مارے ڈر کے چی رہے تھے۔ ٹکسانے مجھ سے کہا ابکی ہولی کی ٹوٹیڑھی جا رہی ہے۔ کٹھن میں۔ جب لوسیدھی اٹھتی ہے تو گائوں میں سال بھر خوشی کا دور رہتا ہے۔ لیکن لوکا ٹیڑھا ہو جانا خوش ہے۔ آخر شعلے تھمنے لگے۔ کبچ کی تیزی کم ہوئی تب کچھ لوگ الاؤ کے نزدیک آکر غور سے دیکھنے لگے۔ جیسے کوئی چیز تلاش کر رہے ہوں۔ ٹکسانے بتلایا کہ جب بسنت کے دن ہولی کی بنیاد پڑتی ہے تو پہلے ایک ارنڈ گلا دیتے ہیں۔ اُسی پر لکڑی اور اُپلے کا ڈھیر لگایا جاتا ہے۔ اسوقت یہ لوگ اُسی ارنڈ کے پودے کی تلاش کر رہے تھے۔ اُس شخص کا بہادر دوں میں شمار ہوتا ہے جو سب سے پہلے اس پودے پر ایسا نشان لگائے کہ وہ ٹوٹ کر دور جا کرے۔ پہلے پٹواری صاحب پتیرا بدلتے آئے۔ مگروس گز کی دوری سے جھانک کر لوٹ گئے۔ تب رادھا ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹا لئے۔ دلیرانہ متقل مزاجی سے آگے بڑھا۔ واگ میں گھسکر وہ بھرپور ہاتھ لگایا کہ پودھا الگ جاگرا۔ لوگ اُن ٹکڑوں کو لوٹنے لگے۔ ماتھے پر اُسکا ٹیکہ لگاتے ہیں۔ اور اُسے متبرک سمجھتے ہیں۔

یہاں سے فرصت پا کر یہ مردانہ جماعت دیوی جی کی استخوان کی طرف بڑھی۔ مگر یہ نہ سمجھتا کہ وہاں دیوی جی کا ادب کیا گیا ہوگا۔ آج وہ بھی گالیاں سننا پسند کرتی ہیں۔ چھوٹے بڑے سب اُنھیں منگلتاں سن رہے تھے۔ چند دن پہلے انھیں دیوی جی کی پوجا ہونی تھی۔ حق یہ ہے کہ دیہات میں اسوقت ایشور کو گالی دینا بھی معاف ہے۔ ماں بہن کا تو

کہیں شمار ہی نہیں۔

سویا ہوتے ہی لالہ جی نے مہراج سے کہا آج کوئی دوسرے بھنگ بھولو۔ اسکی دو
 الگ الگ بھولو۔ نمکین اور شیریں۔ مہراج نکلے۔ اور کئی آدمیوں کو کپڑے لائے بھنگ پیسی
 جانے لگی۔ بہت سے کھڑکھڑکا کر صفائی سے رکھے گئے۔ دو ٹکڑوں میں دونوں قسموں کی
 بھنگ بنائی گئی۔ پھر کیا تھا۔ تین چار گھنٹے تک شائقین کا تانا لگا رہا۔ لوگ خوب تفریحیں
 کرتے۔ اور سر ہلا کر مہراج کی کارگزاریوں کی داد دیتے۔ جہاں کسی نے قدر دانی کی اور
 مہراج نے دوسرا کھڑکھڑا۔ اور بولے یہ نمکین ہے۔ اسکا بھی سوا دیکھ لو۔ اجمی بی بھی لو۔
 کیا روج روج ہولی آئیگی۔ کہ روج روج ہمارے ہاتھ کی بنی ہوئی بوٹی ملیگی۔ اسکے جواب
 میں کسان ایسی نکاحوں سے تالک تباہے گویا کسی نے اُسے نعمت دیدی۔ اور ایک کے بدلتے تین
 کھڑکھڑ چٹ کر جاتا ہے۔ پٹواری کے داماد منشی بگدہ مبار شاو صاحب تشریف لائے ہیں۔
 آپ کچھری میں عریض نویس ہیں۔ انھیں مہراج نے اسقدر پلا دی کہ آپ سے باہر ہو گئے
 اور ناچنے کو نہ لگے گاؤں کا گاؤں انھیں آماجگاہ ظرافت بنائے ہوئے تھا۔ ایک
 کسان آتا ہے اور انکی طرف منکر کرکے کہتا ہے۔ ”تم یہاں کھاڑھی ہو۔ گھر جا کے کھانا بچاؤ۔
 ہم آدہ ہیں“ اسپر ایک فرمالینشی قہقہہ پڑتا ہے۔ کاشی بھر وہ ہرانتہ جھائے۔ اٹھ کندھے پر
 رکھے ہوئے آتا ہے اور حاضرین کی طرف نقلی غصہ سے دیکھ کر کہتا ہے ”مہراج! یہ
 اچھی بات نہیں ہے کہ تم ہمارے نئی بُہریاسے مجالوت ہو“ یہ مکروہ منشی جی کو سینہ سے
 چمٹا لیتا ہے۔ منشی جی پیارے مختصر آدمی۔ ادھر اُدھر پھڑپھڑاتے ہیں۔ مگر نفارے کی آوازیں
 طوطی کی کون سناتا ہے۔ کوئی انکو جو مٹاتا ہے۔ کوئی پیار کرتا ہے۔ کوئی گلے لگاتا ہے۔ دوپہر
 تک یہی چھیڑ چھاڑ ہوا کی۔ انکی دلگی ایسی بھدی اور غلیظ ہوتی ہے کہ کئی بار میراجی بد مزہ ہو گیا

میرے ساتھ اپنے وقت کو کیا اب سے زمانہ عصر بھی چلے گا
 میرا پہلی حد سے کہتا ہوں ۱۱۹

دو پہر ہو گیا لیکن تمنا ابھی تک بیٹھی ہوئی تھی۔ سینے اُس سے کہا آج ہمارے یہاں تمنا
 نیو تہ ہے۔ ہم تم ساتھ ساتھ کھائیں گی۔ یہ سنتے ہی مہرجن دو تھالیوں میں کھانا کھانے
 سے پر سکون لائیں۔ تمنا اس وقت کھڑکی کی طرف منہ کئے کھڑی تھی۔ میں نے جوا کھا ہوا
 پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ تو اُسے اپنی پیاری پیاری آنکھوں سے موتی کے دانے بکھیرتے
 ہوئے پایا۔ گلے لگا کر لولی سکھی سچ سچ بتلا دو کیوں رو رہی ہو۔ مجھے کوئی پردہ مت
 رکھو۔ اس پر وہ اور بھی سکھنے لگے۔ جب میں بہت پر بعد ہوتی تو اُس نے سر نیچا کر کے کہا۔
 ”تم آج سویرے اُن پر نشان پڑ گیا۔ نہیں معلوم اُن پر کیا بیت رہی ہو گی“۔ یہ لکھوہ زائد غلط
 رونے لگی۔ معلوم ہوا کہ رادھا کے باپ نے کچھ قرض لیا تھا۔ وہ ابھی تک ادا نہیں کیا تھا۔
 مہاجن نے سمجھا اُسے حالات لیسچلوں تو رو پر وصول ہو جائے۔ رادھا کئی کاٹا پھرنا تھا۔
 آج حریفوں کو موقع مل گیا۔ اور وہ اپنا کام کر گئے۔ افسوس! مواخذہ میں روپیہ سے
 زائد نہ تھا۔ پہلے مجھے معلوم ہوتا تو غریب پر برس برس کے دن یہ مصیبت نہ آنے
 باقی۔ میں نے چپکے سے مہراج کو بلایا۔ اور اُنھیں میں روپے دیکر رادھا کو راہ کرنے
 کے لئے روانہ کیا۔

اس وقت میرے دروازہ پر ایک ماٹ بچھا دیا گیا تھا۔ لالہ جی بیچ میں قالین پر بیٹھے
 تھے۔ کسان لوگ گھٹنے تک دھوئیاں باندھے۔ کوئی کرتے پہنے۔ کوئی ننگے بدن۔ کوئی بڑے
 گڑھی باندھے۔ کوئی ننگے سر۔ منہ پر غیر ملے (جوانکی کالی صورت پر خاص کیفیت پیدا کر رہی
 تھی) آنے لگے۔ جوا لالہ جی کے بیروں پر تھوڑی سی عبیر رکھ دیتا۔ لالہ جی ہی اپنی نظری
 میں سے فدا سی عبیر نکال کر اسکے ماتھے پر لگا دیتے۔ اور مسکرا کر کوئی دلی کی بات کہہ دیتے۔
 وہ خال ہو جاتا۔ زمین و وز ہو کر سلام کرتا۔ اور ایسا خوش خوش آکر بیٹھ جاتا۔ گویا

اُسے کوئی دولت ملی ہے۔ مجھے خواب میں بھی گمان نہ تھا کہ اللہ ہی ان اُجدد بہاتوں کے ساتھ بیٹھ کر ایسے مزے سے باتیں کر سکتے ہیں۔ اسی اثنا میں کاشی بھر آیا۔ اُسکے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پیالی تھی۔ اُسیں عبیر لئے ہوئے تھا۔ مگر اُس نے اوروں کی طرح عبیر اللہ جی کے پیروں پر نہیں رکھی۔ بلکہ بڑی دلیری سے مٹھی بھر لیکر اُنکے چہرے پر اچھی طرح ملدی۔ میں تو ڈر سی کہیں اللہ جی بد مزہ نہ ہو جائیں۔ مگر وہ بہت خوش ہوئے اور خود بھی بجائے ایک ٹیکہ لگانے کے دونوں ہاتھوں سے اُسکے منہ میں عبیر ملی۔ بعد ازاں مسکرا کر کہا آج اپنے گھر میں کھدینا ہمارے لئے بچاؤن تیار رہے، کاشی نے بھی اُسی طرح مسکرا کر کہا ”سرکار ہم برس برس کے دن کہاں جاتیں گے؟ اس وقت کاشی کا چہرہ دیکھنے قابل تھا۔ وہ اپنی نگاہ میں اپنے تمام ساتھیوں کا راجہ معلوم ہوتا تھا۔ اُسکے ساتھی بھی اُسکی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کہ بینک تو شیر ہے۔ اور تو اس قابل ہے کہ ہمارا سردار بنے۔ اسی طرح ایک ایک کر کے دو ڈھائی سو آدمی جمع ہو گئے۔ یکا یک انھوں نے کہا آج کہیں رادھانیں نظر آتا۔ کیا بات ہے۔ کوئی اُسکے گھر جا کے دیکھے تو فتنی جگہ مبارکشاں اظہارِ لیا کا اچھا موقع دیکھ کر بول اُٹھے۔ ”حضور وہ تو بہ علت قرضہ زید دفعہ ۳۱۰ نمبر الف ایکٹ (ج) گرفتار ہو گیا۔ رام دین پانڈے نے وارنٹ کا خرچہ داخل کر دیا تھا۔ حُسن اتفاق سے رام دین پانڈے بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ لالہ نے اُنکی طرف نہایت حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا کیوں پانڈے جی اس غریب کو حوالات میں بند کرانے سے ہمتارا مگر بھر جائیگا۔ یہی انسانیت اور شرافت اب رہ گئی ہے۔ تمھیں ذرا بھی رحم نہ آیا کہ ہولی کے دن اُسے بیوی بچوں سے الگ کر دیا۔ میں تو بہ ایمان کہتا ہوں کہ اگر میں رادھا ہوتا تو جیلخانہ سے واپس آنے کے بعد میری پہلی کوشش ہولی کر سننے مجھے یہ دن دکھایا ہے اُسے میں بھی

کچھ دنوں ہندی پلوادوں۔ تمہیں شرم نہیں آتی کہ اتنے معتبر مہاجن ہو کر تنے میں سچو کے لئے ایک غریب آدمی کو یوں مصیبت میں ڈالا۔ ڈوب مرنا چاہئے ایسی للچ پڑ لالچی کو واقعی غصہ آگیا تھا۔ رام دین ایسا خفیف ہوا کہ سب سٹی پٹی بھول گئی۔ منہ سے بات نہ نکلی۔ چپکے سے کچھری کی طرف چلے سب کے سب کسان اُسکی طرف غضبناک نگاہوں تاک رہے تھے۔ اگر لالہ جی کا خون نہ نہتا تو پاؤں سے جی کی پٹی پسلی دیں پور ہو جاتی۔ اسکے بعد لالہ جی گھر میں آئے۔ اور اپنے کمرہ میں بیٹھ کر بنت عنب سے کچھ بنوٹے کرنے لگے۔ باہر حاضریں مغل نے گانا شروع کیا۔ نشہ میں تو سب کے سب چور ہو ہی رہے تھے۔ اسپر لالہ جی کے ان برادرانہ خاطر مدارات نے اُنکے دلوں کو اور بھی اُبھار دیا تھا۔ خوب ہی جی توڑ کر گایا۔ دفلی تو ایسی زور سے بختی تھی کہ اب بھٹی اور اب بھٹی۔ جگدہا پٹیاں نے دوہرا نشہ جمایا تھا۔ کچھ تو اُنکے دل میں خود بخود اُننگ پیدا ہوا۔ کچھ دوسروں نے استغلا دیا۔ آپ بچ مجلس میں کھڑے ہو کر ناچنے لگے۔ یقین مانو ناچنے لگے۔ مینے اچکن۔ ٹوپی۔ دھوتی اور موچھوں والے آدمی کو ناچتے نہ دیکھا تھا۔ آدھ گھنٹے تک وہ بندہ دل کی طرح اُچھلتے کودتے رہے۔ آخر نشہ نے انہیں زمین پر سولا دیا۔ اُنکے بعد ایک اور اہیر اُٹھا۔ ایک اہیرن بھی زنانہ جماعت سے نکلی۔ اور دو دنوں میدان میں جا کر ناچنے لگے۔ دنوں نوجوان تھے۔ اور چھرتیلے۔ اُنکی کمر اور لپٹ کی لچک واقعی حیرت انگیز تھی۔ دن تال مے ربا تھا۔ اُنکے رزم و کنائے۔ عشوے و غمزے۔ کمر کا پھٹنا اور بوٹی بوٹی کا پھڑکن۔ گرون کا موڑ اور عصا کا حرور و یکھکر حیرت ہوتی تھی۔ بہت مشق اور محنت کا کام ہے۔ مگر اکثر ادائی اور کنائے جیمانی اور بے شرمی کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ تسلا بھی تاجتی ہے۔ مگر ادھا کے سوا اور کسی کے ساتھ نہیں۔ اور یہی چاہئے بھی۔

ابھی یہاں ناچ ہی ہو رہا تھا کہ سامنے بہت سے آدمی لمبی لمبی لاثھیاں کندھوں پر رکھے آتے دکھائی دئے انکے ساتھ ایک دن بھی تھا۔ اور کئی آدمی ہاتھوں میں جھانجھ اور مجھیرے لئے ہوئے تھے۔ وہ گاتے بجاتے آئے۔ اور ہمارے دروازے پر رُکے۔ یکایک تین چار آدمیوں نے ملکر ایسی زور سے آر۔ آر۔ آر۔ آر۔ کبیر کا غرہ لگایا کہ مکان ہل اُٹھا۔ لالہ جی نکلے۔ یہ لوگ اُسی موقع کے تھے جہاں نگاسی کے دن لاثھیاں چلی تھیں لالہ جی کو دیکھتے ہی کئی آدمیوں نے انکے منہ پر عیر ملی۔ لالہ جی نے بھی جواب دیا۔ پھر لوگ فرش پر بیٹھے لالچی اور بان سے خاطر لگی۔ پھر گانا ہوا۔ اس گانوں والوں نے بھی عیریں ملیں اور ملوائیں۔ جب یہ لوگ رخصت ہونے لگے تو یہ بولی گئی۔

سدا اندر ہے اس دوارے + نہ موہن کھیلیں ہو ری

کتنا خوبصورت گیت ہے مجھے تو اس میں جذبہ اور اثر کوٹ کوٹ کوٹ کوٹ کبھرا معلوم ہوتا ہے۔ بولی کی غرض اور غایت کیسے سادے اور مختصر الفاظ میں بیان کر دی گئی ہے۔ سدا اندر ہے اس دوارے موہن کھیلیں ہو ری۔ میں بار بار یہ پیارا گیت گاتی ہوں اور مزہ لیتی ہوں۔ بولی کا تہوار آپس میں اخلاص و پیار۔ محبت و اتحاد بڑھانے کے لئے ہے۔ ممکن نہ تھا کہ وہی لوگ جن سے چند روز قبل مانتھا پھٹول کی نوبت آچکی تھی اس گانوں میں یوں بے محابا چلے آئے۔ مگر یہ بولی کا دن ہے۔ آج کسی کو کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ آج امن کی بادشاہت ہے۔ آج محبت اور مسرت کا راج ہے۔ آج خوشی کا دور ہے۔ آج کے دن اگر رنج کرے تو پردیسی بالم کی آلبا۔ روئے تو تو جوان بیوہ۔ ان کے سوا اور سب کے لئے خوشی کا صلائے عام ہے کہ خوب مزے کر دے اور خوب کچھ کھائے اُڑاؤ۔

آنے جانیا والوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ یکایک لالہ جی کی ستین آواز آر۔ آر۔ کبیر

کہتی ہوئی سُسناتی دی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو واقعی وہی
 گانوں پر ہاتھ دھرے۔ آر۔ آر۔ آر۔ کی ہانک لگا رہے ہیں۔ کبیر یہ ہے۔
 ہولی کے دن آئے پیارے کہ گھر گھر ڈھنڈھورا دیو پھرائے۔
 جو نر اب مدرانہ پئے داکو ساتوں جنم نساے۔

خوب! لالہ جی کی زبان سے اور یہ ہولی! شام کی وقت گانوں کی سب عورتیں ہمارے
 یہاں ہولی کھیلنے آئیں ہر ایک اپنے اپنے لٹے میں کھلی ہوئی عبرت ہوئے تھے۔ ماں نے
 انہیں بڑی عزت سے بٹھایا۔ رنگ کھیلایا۔ پان لقمہ کیا۔ میں مارے خون کے باہر نہ نکلے۔
 اس طرح نجات ملی۔ اب مجھے خیال آیا کہ مادھوی دو پھر سے غائب ہے۔ میں نے
 سوچا تھا خاندان گانوں میں ہولی کھیلنے گئی ہو۔ مگر ان عورتوں کے ساتھ وہ نہ تھی۔ تلسا
 ابھی تک چپ چاپ من مارے کھڑکی کی طرف منہ کئے بیٹھی تھی۔ چراغ میں بتی پڑی
 تھی کہ وہ یکایک اُٹھی اور میرے پیروں پر گر کر روئے لگی۔ میں نے کھڑکی کی طرف جھانکا
 تو دیکھتی ہوں کہ آگے آگے مہراج۔ اُنکے پیچھے رادھا۔ اور سب سے پیچھے رامدین پانڈ
 چلے آ رہے ہیں۔ گانوں کے بہت سے آدمی اُنکے ساتھ ہیں۔ رادھا کا چہرہ مڑجھا یا ہوا ہے
 لالہ جی نے جوں ہی سُنا کہ رادھا آ گیا چٹ باہر نکل آئے۔ اور بڑی محبت سے اُسے
 گلے لگالیا۔ جیسے کوئی اپنے بیٹے کو گلے لگاتا ہے۔ رادھا چیخیں مار مار کر روئے لگا۔
 تلسا بھی ضبط نہ ہو سکا وہ زمین سے اُتری۔ اور لالہ جی کے پیروں پر گر پڑی۔ لالہ جی نے
 اُسے بھی بڑی محبت سے اُٹھایا۔ میری آنکھوں سے بھی اُس وقت ضبط نہ ہو سکا۔ گانوں
 کے بہت سے آدمی رو رہے تھے۔ نہایت دردناک سین تھا۔ لالہ جی کی آنکھوں میں مٹنے
 کبھی آنسو نہیں دیکھے تھے۔ وہ اس وقت دیکھے۔ رامدین پانڈے سوچا کئے ایسا کھڑا تھا

جیسے گوہتیا کی ہو۔ میرے روپے مل گئے۔ مگر نیت ہے اسے تلسا کے لئے ایک گائے لینے میں خرچ کروں۔

رادھا اور تلسا دونوں اپنے گھر گئے۔ مگر ذرا دیر میں تلسا مادھوی کا ہاتھ پکڑے
 ہنستی ہوئی میرے کمرہ میں آئی اور بولی کہ ”لے پوچھو یہ اب تک کہاں تھیں“
 میں ”کہاں تھیں تم؟“ دوپہر سے غائب ہو۔

مادھوی ”یہیں تو تھی“
 میں ”یہاں کہاں تھیں۔“ میں نے دوپہر سے نہیں دیکھا۔ سچ سچ بتاؤ۔ میں ناراض ہو گئی۔
 مادھوی ”تلسا کے گھر تو چلی گئی تھی“

میں ”تلسا تو یہاں بیٹھی ہے۔ وہاں اکیلے کیا سوتی رہیں؟“
 تلسا (دھنک) ”سوتی کا ہیکو رہیں۔ جاگتی رہیں۔ کھانا پکاتی رہیں۔ چوکا برتن کرتی رہیں۔
 مادھوی ”ہاں چوکا برتن کرتی رہی۔ کوئی ہتھارا تو کر لگا ہوا ہے نہ“

معلوم ہوا کہ جب سے میں نے مہراج کو رادھا کو چھڑانے کے لئے روانہ کیا تھا تب سے
 مادھوی تلسا کے گھر کھانا بنانے میں مصروف تھی۔ اُسکے کو اڑکھولے۔ یہاں سے اٹا۔
 گھی۔ شکر سب لگتی۔ آگ جلاتی۔ اور پوریاں کجوریاں۔ گلگلے میٹھے سمو سے سب بڑی تھنا
 سے بنائے۔ اُس نے سوچا تھا کہ میں یہ سب بنا کر چپکے سے چلی جاؤنگی۔ جب رادھا اور
 تلسا آئیں گی تو تعجب کریں گی۔ کہ کون بنا لیا۔ مگر غالباً دیر زیادہ ہو گئی۔ اور مجرم پکڑ لیا گیا۔
 دیکھو کیسی نیک بخت لڑکی ہے۔

اتنی سمع خراشی کے بعد نصرت ہوتی ہوں۔ شکایتیں معاف کرنا۔ تمہاری چیری
 ہوں جیسے رکھو گے دیے رہو نگے۔ عمیر اور گلال بھیجتی ہوں۔ یہ تمہاری کنیز کا تحفہ ہے۔

تمہیں ہماری قسم جھوٹی تہذیب کے جوش میں اگر اسے پھینک نہ دیتا۔ ورنہ میرا دل دکیگا۔

مہتماری بہین

مجاہدوں

پیارے! تمہارے خط نے بہت رونا لایا۔ اب نہیں رہا جاتا۔ مجھے بلالو۔
ایک نظر دیکھ کر جلی آؤنگی۔ سچ بتاؤ اگر میں تمہارے یہاں آ جاؤں تو مسخرے پن کی توڑ لو گے۔
نہیں معلوم دل میں کیا سمجھو گے۔ مگر کیسے آؤں۔ تم لالہ جی کو لکھو۔ خوب اداہ کیں گے
بیہوشی دھن ساقی ہے۔

کل چار پانی پر پڑی تھی۔ سویرا ہو گیا تھا۔ خوب ٹھنڈی ٹھنڈی۔ دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی کہ عورتوں کی گانے کی آواز کان میں آئی۔ عورتیں انانج کاٹنے جا رہی تھیں۔ جہانک کر دیکھا تو دس دس بارہ بارہ عورتوں کی ایک ایک جماعت تھی۔ سبھوں کے ہاتھوں میں صنیا کندھے پر گٹھیا باندھے کی سی اور سر پر بھنے ہوئے مٹر کی جھیری تھی۔ یہ اسوقت جاتی ہیں کہیں بارہ بجے لوٹیں گی۔ آپس میں گاتے۔ چیلیں کرتے چلی جاتی تھیں۔ اور گیت بھی کیسا سہانا تھا۔

مورا سٹیاں گھرے آئے۔ رتیاں

جُن جنِ کلیاں میں سیج بچایوں + سیج نہ سوئے دمہرے مہرے بہاں

مورے سنیاں گھرے آئے رتیاں

صبح کا وقت مستانہ آوازیں۔ مسرت سے بھرے ہوئے دل۔ یہ گیت بہت

مرے وار معلوم ہوتا تھا۔ اُنکے ستیاں گھر آئے۔ کیا میرے گھر بھی کبھی ستیاں آئیں گے۔

دو پہر تک بڑی خیریت سے گزری۔ یکایک آسمان پر بادل بھاگ گیا۔ آندھی آگئی۔

اور او لے گرنے لگے۔ میں نے اتنے بڑے او لے گرتے نہ دیکھے تھے۔ آلو سے بڑے۔

اور ایسی تیزی سے گرے۔ جیسے بندوق کی گولی۔ دم کی دم میں زمین پر ایک فٹ اونچا

او لے کا سفید فرش بچھا گیا۔ چوڑے سے کسان بھاگنے لگے۔ گائیں بیل بکریاں سب

چلا تی، موئی پیڑوں کا سایہ ڈھونڈھتی پھرتی تھی میں ڈری کہ نہیں معلوم

تلسا پر کیا بیٹی۔ نظر دوڑا کر دیکھا تو ایک کھلے میدان میں جوانا ج کے کٹ جانے سے

کھنکھ دست ہوا تھا تلسا۔ رادھا اور موہنی گائے نظر آئیں۔ تینوں گھسان او لے کی زد

میں پڑے ہوئے تھے تلسا کے سر پر ایک چھوٹی سی ٹوکر سی تھی۔ اور رادھا کے سر پر

ایک بڑا سا گٹھا۔ میرے آنکھوں میں آنسو بھر آئے کہ نہیں معلوم ان بیچاروں کا کیا حشر

ہو گا۔ دفعتاً ایک سخت جھونکے نے رادھا کے سر سے گٹھا گرا دیا۔ گٹھا کا گرنا تھا کہ دم

زدن من تلسا نے اپنی ٹوکر سی اُسکے سر پر اونڈھادی۔ نہیں معلوم اُس پھول جیسے جسم پر

کتنے او لے پڑے۔ اُسکے ہاتھ کبھی بیٹھہ پر جاتے۔ کبھی سر سے لگاتے۔ ایک منٹ سے

زیادہ یہ حالت نہ رہی ہو گی کہ رادھا نے بجلی کی طرح جھپٹ کر گٹھا اٹھا لیا۔ اور ٹوکر سی تلسا

کو دیدی۔ کیسی زبردست محبت ہے!

ظالم آسمان نے سارے سامان بگاڑ دیئے۔ سویرے عورتیں گاتے ہوئے

ہا ہری تھیں۔ شام کو گھر گھر ماتم بپا تھا۔ کتنوں کے سر لہو مان ہو گئے۔ کتنے ہلدی پیڑے

ہیں۔ فصل ستیا ناس ہو گئی۔ اتاج برون کے تلے دب گیا۔ بخار کا نور ہے۔ سارا گائوں

اسپتال بنا ہوا ہے۔ کاشی بھر کی پیشین گوئی صادق آئی۔ ہولی کے شعلہ نکارا ز ظاہر ہو گیا۔

فصل کا یہ حال۔ اور مالگنداری وصول کی جا رہی ہے۔ بڑی بدعت ہو رہی ہے۔
مار و محاذ گالی گفٹہ غرض سبھی ہتھیاروں سے کام لیا جا رہا ہے۔ غریبوں پر یہ قہر خدا۔

تمہاری برجن

(۶)

مجکائوں۔

مرے جان سے پیارے بالم۔ پورے پندرہ دن کے بعد تم نے برجن کو یاد کیا۔
خط کو بار بار پڑھا۔ چوما۔ آنکھوں سے لگایا۔ اور ایک ایک حرف کا مزہ لیا تمہارا خط
بلا لائے نہیں مانتا۔ میں یوں بھی بہت۔ دیا کرتی ہوں۔ تھکو کن کن باتوں کی یاد دلاؤں۔
میرادل ایسا کمزور ہے کہ جب کبھی ان باتوں کی طرف خیال جاتا ہے تو عجب بچینی سے ہوجاتی
ہے۔ گرمی ہی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایک بڑا بے چین کر نوالا۔ بڑا مزہ۔ بہت زلانیوالا۔

بہت پر حسرت و رنج و محسوس ہونے لگتا ہے۔ جانتی ہوں کہ تم نہیں
آ رہے ہو۔ اور نہ آؤ گے۔ مگر بار بار دروازہ پر جا کر کھڑی ہوجاتی ہوں کہ تم آؤ
نہیں گئے۔ آجکل تمہارے لئے ایک ریشمی بوٹے دار قمیض تیار کر رہی ہوں۔ جی چاہتا ہے
تم یہاں آتے۔ میں کتنی ذرا ٹھیک و رو دیکھو ٹھیک کٹی ہے یا نہیں۔ تب سلائی طے کرنے لگتی۔
تم کچھ اور دیتے۔ میں کچھ اور مانگتی۔ مگر لو۔ ایسی باتیں نہ کرونگی۔ تمہارا ہرج ہوگا۔

کل شام کو یہاں ایک بڑا دلفریب تماشہ دیکھنے میں آیا۔ یہ دھویو نکالچ تھا۔ پندرہ
بیس آدمیوں کی ایک جماعت تھی۔ انہیں ایک نوجوان شخص۔ سفید پوشا پہنے۔ کمر میں بے شمار
گھنٹیاں باندھے۔ پیر میں گھونگھرو پہنے۔ سر پر ایک لال ٹوپی۔ کھٹے ناچ رہا ہے۔ جب

جب یہ شخص ناچتا ہے تو مردنگ بجنے لگتی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ہولی کا انعام مانگنے آئے ہیں۔ یہ ذات بھی عجیب انعام لینے والی ذات ہے۔ آپ کے یہاں کوئی کام کاج پڑے تو انھیں انعام دیجئے۔ اور انکے یہاں کوئی کام کاج ہو تو بھی انعام دے جائیے۔ یہ لوگ ناچتے وقت گیت نہیں گاتے۔ انکا گانا انکی شاعری ہے۔ پشواں والا شخص ڈھول پر ہاتھ رکھ کر ایک برہا کتا ہے۔ دوسرا آدمی سامنے سے آکر اس برہے کا جواب دیتا ہے۔ اور دونوں فی البدیہہ کہتے ہیں۔ اس ذات میں شاعرانہ قابلیت بہت زیادہ ہے۔ ان برہوں کو غور سنو تو انہیں بعض نہایت باریک شاعرانہ خیالات ادا کئے جاتے ہیں۔ پشواں والے شخص نے پہلا برہا جو کہا تھا اسکے یہ معنی تھے کہ اے دھوبی کے بچے۔ تم ککے دروازہ پر آکر کھڑے ہو۔ دوسرے نے جواب دیا تھا اب ذاکر شاہ ہے نہ راجہ بھوج۔ اب جو ہیں ہمارے مالک ہیں۔ انھیں سے مانگو میرے برہے کا مطلب تھا کہ منگنوں کی عزت کم ہو جاتی ہے۔ اسلئے تم لوگ کچھ سوال مت کرو۔ گا بکا جیٹے چلو۔ دینے والا بن مانگے ہی دیکھا۔ گھنٹ بھر تک یہ لوگ برہے کہتے رہے۔ تمھیں یقین نہ آئیگا۔ انکے منہ سے برہے اس طرح بے تکلف نکلتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ شاید اتنی آسانی سے وہ بات جیت بھی ذکر سکیں۔ یہ ذات بڑی بلا نوش ہے۔ انتہادر جب کی سیکڑ۔ شراب پانی کی طرح پیتے ہیں۔ بیاہ میں شراب۔ گونے میں شراب۔ بچپیت میں شراب۔ پوجا پاٹ میں شراب۔ انعام مانگیں گے تو پینے کے لئے۔ دھولائی مانگیں گے تو یہ لکڑ کر آج پینے کو پیسہ نہیں ہے۔ رخصت ہوتے وقت بیچو دھوبی نے جو دعائیہ برہا کہا تھا وہ شاعرانہ استعارات سے بھرا ہوا ہے۔

تمہارا پر وارا اس طرح برہے جیسے لنگا کا پانی۔ لڑکے پھلیں پھولیں جیسے آم کی بور۔ مالکن کا سہاگ سدانتا رہے۔ جیسے دوب کی ہربالی۔ کیسی نادر شاعری ہے۔ زیادہ بجز اشتیاق دیدار کے اور کیا کہوں۔

مجگانوں۔

پیارے۔ ایک ہفتہ تک خاموش رہنے کی معافی چاہتی ہوں۔ خوب! اکچو حکم ہنگام
 کا کیسا نادر موقع ہاتھ آیا ہے۔ واہ رے بسٹ دھرمی۔ مجھ پر الزام کہ ہفتوں سُدہ نہیں لےتی ہو۔
 بجا فرماتے ہو۔ میرے خطوط لکھ کر دیکھو تو۔ ابھی کچھ نہیں تو نصف درجن چٹھیوں کے ویدار
 ہو گئے۔ مجھے اس ہفتہ میں بالکل فرصت نہیں ملی۔ مادھوی بیمار ہو گئی تھی پہلے تو کوئین کی
 چند پڑیاں کھلائی گئیں۔ مگر جب اس سے افادہ نہوا۔ اور اُسکی حالت بہت خراب ہو گئی
 تو دہلوراسے بید کلائے گئے۔ کوئی پچاس کا سن ہوگا۔ برہمنہ پا۔ سر پر ایک بگڑی باندھے۔
 کندھے پر انگو چھار رکھے۔ ہاتھ میں موٹا سا سونے والا دروازہ پر اک بیٹھ گئے۔ گھر کے بڑے
 زمیندار ہیں۔ مگر انکے دل پر کسی سیدھی مرزائی نہیں دیکھی۔ اُنھیں اتنی فرصت
 ہی نہیں کہ اپنی تن پروری کی طرف متوجہ ہوں۔ اس نواح میں آٹھ دس کوں تک لوگ انکے
 معتقد ہیں۔ نہ وہ حکیم کو جانیں۔ نہ ڈاکٹر کو۔ اُنکا حکیم ڈاکٹر جو کچھ ہیں وہ دہلوراسے ہیں۔
 پیغام منتہی آکر دروازہ پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹروں کی طرح نہیں کہ پہلے سودی مانگیں گے۔ بلکہ
 جان چست۔ تاکہ اُنکا وقت ضائع نہو۔ آپکے گھر آکر ایسے خاموش بیٹھے رہیں گے گویا گنگے
 کا گڑ کھا گئے ہیں۔ مریض کو دیکھنے جائیں گے تو اس طرح بھانگیں گے گویا کرہ کی ہوا میں زہر پڑا
 ہوئی ہے۔ تشخیص مرض۔ تجویز دوا سب کچھ دو منٹ میں ختم! دہلوراسے ڈاکٹر نہ سہی۔ مگر جتنے
 آدمیوں کو انکی ذات سے فیض پہونچا ہے۔ انکی اتھ اوکا اندازہ کرنا محال ہے۔ ہمدردی انکا
 اصل ہے۔ انکی صورت دیکھتے ہی مریض کا آدھا روگ دور ہو جاتا ہے۔ اُنکے نسخے ایسے سہل
 اور عام کہ بلا دوا کوڑی خرچ کئے منہل بٹور لائے۔ تین ہی دن میں مادھوی چلنے پھرنے لگی۔

واضحی اس شخص کی دوا میں اعجاز ہے!

یہاں اندولوں مغلّے اُدھم مچائے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ جاڑے میں کپڑا دھو جاتے ہیں۔ اور جیت میں دام وصول کر لیتے ہیں۔ اُس وقت کوئی عذر نہیں سنتے۔ گالی گلج۔ ہٹ۔ سبھی باتوں پر اُتر آتے ہیں۔ دو تین آدمیوں کو بہت مار مارا دھانے بھی کچھ کپڑے لئے تھے۔ اُسکے دروازے پر جا کر سب کے سب گالیاں بکنے لگے۔ تمنا نے اندر سے کواڑ بند کر لئے۔ جب یوں بس نہ چلا تو ایک نے موہنی گائے کھونٹے سے کھول لی۔ اور کشاں کشاں چلا۔ اتنے میں رادھا دور سے آتا دکھائی دیا۔ آتے ہی آتے اُسے لاٹھی کا وہ بھر لپکا ہوا دیا کہ مغلّے کی کلانی لٹک پڑی۔ تب تو مغلّے گرم ہوئے۔ پیرے بدلنے لگے۔ رادھا بھی جان پر کھیل گیا۔ اور تین بد معاشوں کو بیکام کر دیا۔ اتنے میں کاشی بھرنے اگر ایک مغلّے کی خبر لی۔ دہلورائے کو مغلیوں سے چڑھ رہے۔ وہ فخریہ کہا کرتے ہیں کہ میں نے انجا اتنا روپیہ ڈبا دیا۔ اتنوں کو پٹوا دیا۔ یہ شور و غل سنتے ہی پوچھنے اور للکارا صد ہا آدمی اٹھیاں لے لے کر دوڑ پڑے۔ اور مغلیوں کی خوب مرست ہوئی۔ یقین ہے کہ اب اوہر آنے کی جرات نہ کریں گے۔

اب تو منی کا حینہ گزرا۔ کیا ابھی فرصت نہیں ہوئی۔ رات دن تمہارے آنیکا انتظار۔ شہر میں بیماری کم ہو گئی۔ اور ہم لوگ بہت ہلکے ہیں۔ اسوس تم اس پیارے گانوں کی سیر نہ کر سکو گے۔

تمہاری بہن

(۸)

پیارے۔ تمہاری خوشی مارے ڈالتی ہے۔ کل ہم لوگ شہر آگئے۔ اب تم بھی آؤ۔

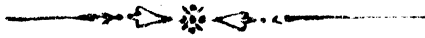
وہاں پڑے پڑے کیا کر رہے ہو۔ دو تین خط لکھ چکی۔ مگر نہ آتے ہو۔ نہ جواب دیتے ہو۔ رات کو آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں۔ رات کو آنکھیں نہیں بھپکتیں۔ کتابچہ نکال کر میرا دل دھڑکنے لگا۔ کبھی کی آواز آئی اور میں چونک کر اٹھ بیٹھی۔ شاید مجھے ناراض ہو۔ خیر یہاں کسی طرح تو جاؤ۔ تمہاری ناراضگی کا علاج تو میرے پاس ہے۔ اب رخصت ہوتی ہوں۔ چراغ کے سامنے نہیں بیٹھا جاتا۔ ایفدور کر کے سویرے تمہارا درشن ہو۔ اور یہ خط لکھو متا ہوا یہیں آوے۔

تمہاری برہن

(۹)

پیارے! لالہ جی کو خط لکھا۔ اور مجھے نہیں۔ میں نے ایسا کیا قصور کیا تھا۔ خیر کچھ شکر ہے تم خیریت سے تو ہو۔ میرے لئے یہی بہت ہے۔ اب آنے کے لئے نہ کوئی۔ جو کچھ دل پر بیگی ہو کوئی۔ ککے آگے روئے۔ اپنا دیدہ کھوئے۔ اور رخصت! بہتر ہے مراد آباد جاؤ۔ یہاں تمہارا کون ہے۔

تمہاری برہن



انیسویں فصل

بالکرام اور کمالاچرن

پرتاپ چند کو الہ آباد کالج میں پڑھتے تین سال ہو چکے تھے۔ اور اس مدت میں اُس نے اپنے سمجھنوں اور اتالیقوں کی نگاہوں میں بہت ممتاز درجہ حاصل کر لیا تھا کالج کی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہ تھا جہاں اُس کے کمالات نے قدردانی کا سہرا نہ پہنا ہو۔ پروفیسر اسپر فخر کرتے۔ اور طلباء اُسے اپنا رہنما سمجھتے۔ جس طرح کھیل کے میدان میں اُس کا دست اعجاز نمایاں تھا۔ اسی طرح لکچر روم میں اُس کی قابلیت اور نگہ رسی مسلہ تھی۔ کالج کے متعلق ایک عالم انجمن احباب قائم کی گئی تھی۔ شہر کے علم دوست رؤساء کالج کے پروفیسر اور طلباء اُس کے ممبر تھے۔ پرتاپ اس انجمن کا ماہ درخشاں تھا۔ یہاں ملکی و محمدنی مسائل پر مباحثے ہوا کرتے تھے۔ اور پرتاپ کی تقریریں ایسی پُر زور اور مدلل ہوتیں کہ پروفیسروں کو بھی اُس کی وسعت تحقیقات اور تلاش پر حیرت ہوتی۔ اُس کی تقریر اور تحریر دونوں ہی میں جادو تھا۔ جو وقت وہ اپنا ساوہ لباس پہننے ہوئے لطیف خاکہ پر جاتا تو حاضرین کی آنکھیں اُس کی طرف اٹھ جاتیں اور دلوں میں گونگندی ہونے لگتی۔ اُس کا انداز تقریر اُس کے اشارے۔ اُس کا لب و لہجہ۔ اُس کے ہنسی کی حرکت سبھی ایسے موثر تھے کہ اُس کی تقریریں گویا قدرت نے اثر بکھریا ہے۔ جب تک وہ بیٹ فارم پر رہتا حاضرین پر ایک تاثیر کا عالم ہوتا۔ مہربا کے انصرے بار بار بلند ہوتے۔ اس کا ایک ایک فقرہ دلوں میں چھو جاتا۔ اور زبان سے بے اختیار واہ واہ کا شور بلند ہو جاتا۔ اسی خیال سے اُس کی تقریریں عموماً اختتام کے وقت ہوا کرتی تھیں۔ کیونکہ زیادہ تر شکر کارائین صرف اسی کی گرم زبان پر بخا لطف اُٹھانے کے لئے

ایکارتے تھے۔ اُسکے الفاظ اور انداز میں خدا داد اثر تھا جو قوت کسب سے بہت بلند ہے اور
اور تاج اُسکے تفہمات اور مطالعہ کے خاص صیفے تھے۔ قوموں کے عروج و زوال۔ اور
اُسکے اسباب و حالات پر وہ اکثر تقریریں کرتا۔ اسوقت اُسکے ان جگر کاویوں کے محرک
زیادہ تر حاضرین کے لغو تھیں ہوتے تھے، اور انہیں کو وہ اپنی محنت کا کافی بدل سمجھتا تھا۔ ہاں اُسکے
مذاق کی یہ روش و کشش دیکھکر یہ البتہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ یہ ہونہار پر دا آگے چلکر کیسے
پھل پھول لائیگا۔ اور کیسے رنگ روپ نکالے گا۔ ابھی تک اُسنے ایک لمحہ بھر بھی غور نہیں
کیا تھا کہ میری آئندہ زندگی کی کیا صورت ہوگی۔ کبھی سوچنا پر وہ قیصر بن جاؤنگا۔ اور
خوب کتابیں لکھونگا۔ کبھی وکالت کی طرف خیال دوڑائے گا۔ کبھی سوچنا کاش وظیفہ ملجاسے
وہ سول سروس کی تیاری کر دے۔ کسی ایک طرف خیال نہ جوتا تھا۔

مگر پرتاپ چندر اُن طلباء میں نہ تھا جنکی تمام کوششیں مباحثے اور کتابوں ہی تک
محدود رہتی ہیں۔ اُسکے وقت اور لیاقت کا ایک قلیل حصہ رخ فاد عام کے کاموں میں بھی
عرف ہوتا تھا۔ اُسنے خلقۃً ایک ہمدرد اور غریب پرورد دل پایا تھا۔ اور عوام میں ملنے جلنے
اور کام کرنے کی لیاقت اسے باپ سے وراثت میں ملی تھی۔ انھیں مشاغل میں اُسکی توجہ
اور سرگرمی پر سے جوش کے ساتھ ظاہر ہوتی تھی۔ اکثر شام کے وقت وہ کیٹ گنج اور کڑہ کے
متعفن گلیوں کی خاک چھانٹا دکھائی دیتا۔ جہاں زیادہ تر بچی ذاتیں آباد ہیں۔ اُسکی صورت
ان حصوں میں بہت مانوس تھی۔ جن لوگوں کے سایہ سے اونچی ذات کا ہندو دور بھاگتا
اُسکے ساتھ پرتاپ لڑائی کھاٹ پر بیٹھکر گھنٹوں باتیں کرتا۔ اور یہی وہ تھی کہ ان محلوں کے
بے ہالے اسپر فدا ہونیکو تیار تھے۔ نخت اور عیش پرستی۔ یہ دو عیوب پر ناپ چندر میں
نام کو بھی نہ تھے۔ کوئی بکیں آدمی ہو پرتاپ اُسکی دستگیری کے لئے تیار تھا۔ کوئی بیکس

مریض ہو۔ پرتاپ اسکا سچا غمخوار اور تیار ہوا تھا۔ کتنی راتیں اُس نے بھونچڑوں میں کراہتے ہوئے مریضوں کے سرھانے کھڑے رہ کر کالی ٹھٹھیں۔ اسی غرض سے اُس نے رفاہ عام کی ایک سبھا قائم کر رکھی تھی۔ اور ڈھائی سال کے مختصر زمانے میں اس انجمن نے جتنے کارگذاری سے پبلک کی خدمت کی اُس نے الہ آبادیوں کی ہمدردی اس طرف متوجہ کر دی تھی۔ پرتاپ اس انجمن کا روح رواں تھا۔ پچھلے دو سالوں سے اُس نے ظالموں کے دلوں میں بھی۔ جبکہ لوگ اپنے پیاروں کو چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ جان معطلی پر رکھ کر طاعون زدہ خطوں میں علاج معالجہ کرنا شروع کیا تھا۔

کلاچرن جو وقت الہ آباد پہونچا پرتاپ چند رنے اُنکی بڑی اذیت کی۔ مرد و عورتوں نے اُسکے دل سے حسد کی آگ بھادی تھی۔ جو وقت وہ برجن کی بیماری کی خبر یاد کرنا اس پہونچا تھا۔ اور اُس سے ملاقات ہوتے ہی برجن کی حالت منہ بھل چلی تھی اس وقت سے پرتاپ کو یقین ہو گیا تھا کہ کلاچرن نے اُسکے دلیں وہ جگہ نہیں پائی جو میرے لئے مخصوص تھی۔ یہ خیال حسد کا شعلہ فرو کرنے کے لئے کافی تھا۔ علاوہ اُسکے اُسے اکثر یہ خیال بھی بے چین کیا کرتا تھا کہ میری سوسیلہ کا قاتل ہوں۔ میری ہی بد زبانیاں اُس غریب کے جان کا گاہک ہوئیں۔ اور اسی وقت سے جبکہ سوسیلہ نے مرتے وقت اُس سے رورور اپنے خطاؤں کی معافی مانگی تھی۔ پرتاپ نے دل میں ارادہ کر لیا تھا کہ موقع ملا تو میں اس گناہ کی تلافی ضرور کروں گا۔ کلاچرن کی خاطر دمدارات اور تعلیم و تربیت میں اُسے کسی حد تک پرانی شہرت کے پورے کرنا کا ناموقع ہاتھ آیا۔ اگرچہ علم و شعور میں وہ کلاچرن سے منزلوں آگے تھا۔ مگر اُس سے یوں پیش آتا جیسے چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے ساتھ اپنے وقت کا کچھ حصہ اسکی مدد کرنے میں صرف کرتا۔ اور ایسی سہولیت سے اتالیق کا فرض

ادا کرتا کہ تعلیم ایک دلچسپ مباحثہ کی صورت اختیار کر لیتی۔

مگر پرتاپ چند کی ان کوششوں کے باوجود کلاچرن کی طبیعت یہاں بہت گہجراتی۔ سارے بڑوں تک ہاؤس میں اُسکے مذاق کا ایک آدمی بھی نہ تھا جس سے وہ اپنا درد دل کہتا۔ اور اپنے زخم و جگر پر مرہم کر لواتا۔ وہ یار باش بیکرنگین مزان آدمی تھا جسے کُن کے سوا کُل کا کبھی خیال نہیں کیا۔ پرتاپ سے باوجود بے لکھنی کے وہ دل کی بہت سی باتیں نہ کہہ سکتا تھا۔ جب اکیلے پن سے طبیعت بہت اکتائی تو برجن کو کوٹنے لگتا کہ میرے سر پر یہ سب مصیبتیں اسکی لائی ہوئی ہیں۔ اُسے مجھ سے اُنس نہیں۔ زبان اور قلم کی محبت بھی کوئی محبت ہے۔ وہ محبت ہی کیا جو موقع اور مصلحت کی آڈو صوٹ ڈھنسنے لگے۔ میں چاہے اُنہر جان ہی کیوں نہ دیدوں۔ مگر اُنکی محبت زبان اور قلم کے دائرہ سے باہر نہ نکلیگی۔ ایسے بت کے روبرو جو بیچنا جانتا ہی نہ ہو سر پکٹنے سے کیا حاصل۔ ان خیالات نے یہاں تک زور پکڑا کہ اُسے برجن کو خط لکھنا چھوڑ دیا۔ وہ ہجاری اپنے خطوط میں کلیجہ بکا کر رکھ دیتی۔ مگر کلاچوب تک نہ تیا۔ اور دیتا بھی تو خشک اور دلنشین۔ اسوقت اُسے برجن کی ایک ایک بات۔ اُسکی ایک ایک حرکت اُسکی سر و مہری کا پتہ دیتے ہوئے معلوم ہوتی تھی۔ ہاں اگر یاد آتی تھیں تو برجن کی خاطر داریاں۔ اور وسوسیاں۔ وہ فضیلی آنکھیں جو اس سے جدا ہوتے وقت ڈب ڈب لگتی تھیں۔ اور وہ نازک نازک ہاتھ جنہوں نے باہم ملکر اُس سے منٹیں کی تھیں کہ خط برابر بھیجتے رہنا اُسے یاد آجائے تو ممکن تھا کہ اُسے کچھ تسکین ہوتی۔ مگر ایسے موقعوں انسان کا حافظہ دھوکا دیدیا کرتا ہے۔

آخر کلاچرن نے اپنے تنہائی کا ایک مشغلہ سوچ ہی نکالا۔ جسوقت سے اُسے بوش منبھالا اُسیوقت سے بازار حسن کی سیر شروع کی۔ حُسن پرستی اُسکا فریو گنگی تھی

اور اس قسم کا کوئی نہ کوئی مشغلہ اُسکے لئے ایسا ہی ضروری تھا جیسے بدن کے لئے غذا۔
 بورڈنگ ہاؤس سے ملا ہوا ایک سیٹھ کا باغچہ تھا۔ اور اُسکے رکھ رکھاؤ کے لئے ایک
 مالی نوکر تھا۔ اس مالی کے ایک دو شیرہ لڑکی۔ سرحدی تھی اگرچہ بہت حسین نہ تھی۔
 مگر کلاسن کا اتنا طلبگار نہ تھا جتنا کسی دہنگی کے مشغلہ کا۔ کوئی عورت جسکے چہرہ پر
 شباب کی جھلک ہو اُس کا دل بہلانے کے لئے موزوں تھی۔ کلاسن اس لڑکی پر ڈور سے
 ڈالنے۔ شام سویر سے بلاناغہ چین کی روشنیوں میں ٹھٹھاتا نظر آتا۔ اور لڑکے میدان
 میں وندش کرتے۔ مگر کلاسن چرن باغچہ میں اگر تاک جھانک میں معروت رہتا۔ رفتہ رفتہ
 اُسے سرحدی سے شناسائی۔ ہمدردی اور پھر محبت پیدا کر لی۔ وہ اُس سے گھرے مول
 لیتا۔ اور نقد محبت کے علاوہ جو گفنے دام دیتا۔ مالی کو ہتھوڑے کے موقع پر سب سے زیادہ
 ہتھوڑی کلاسن ہی سے ملتی۔ یہاں تک کہ سرحدی اُسکے دام الفت کی اسیر ہو گئی۔
 اوردو ایک بار تاریکی کے پردوں میں باہم ملاقاتیں بھی ہوئیں۔

ایک روز شام کا وقت تھا۔ سب طلبا سیر کو گئے ہوئے تھے۔ کلاسن اکیلا باغچہ میں
 ٹھٹھاتا۔ اور رہ رہ کر مالی کے بھونپڑے کی طرف جھانکتا تھا۔ یکایک مجھو پڑے میں سے
 سرحدی نے اُسے اشارہ سے بلایا۔ اور کلاسن بڑی تیزی سے اندر گھس گیا۔ آج سرحدی
 نے ملل کی ساڑی پہنی تھی جو کلاسن بابو کا تحفہ تھا۔ سرحدی خوشبو دار تیل ڈالنا تھا جو کلاسن بابو
 بازار سے لائے تھے۔ اور ایک چھینٹ کا سلوکا پہنے ہوئے تھے جو انھیں بابو صاحب
 نے ہوا تھا۔ یہ سب کلاسن بابو کی خاطر تھی اپنی طرف سے سرحدی نے مزہ آنکھوں
 میں کاجل لگایا تھا۔ آج وہ اپنی نگاہ میں بہت حسین معلوم ہو رہی تھی۔ ورنہ کلاسن
 امیر اور حسین آدمی کیوں اُس پر جان دیتا۔ کلاسن کھٹو لے پر بیٹھا ہوا سرحدی کی

اداؤں کو مستانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے اسوقت سر جوئی برج رانی سے کسی طرح کم حسین نہیں نظر آتی تھی۔ رنگت میں ذرا سافرق تھا۔ مگر یہ کوئی ایسا بڑا فرق نہیں۔ اُسکی نگاہ میں سر جوئی کی محبت سچی۔ اور زیادہ ہر جوش معلوم ہوتی۔ کیونکہ وہ جب کبھی بنارس جانیکا تذکرہ کرتا تو سر جوئی زار زار رونے لگتی اور کہتی کہ مجھے بھی لیتے چلنا۔ میں تمہارا ساتھ نہ چھوڑو گی۔ کہاں یہ محبت کی گرمی۔ اور جذبات کا زور۔ اور کہاں برہن کی نیم دلانہ خاطر داریاں۔ اور پیر حمانہ مصالحت آمیزیاں۔

کھلا ابھی اچھی طرح آنکھوں کو سینکے بھی نہ پایا تھا کہ یکایک مالی نے دروازہ پر آکر کھٹکھٹایا۔ اب تو کالٹو بدن میں لہو نہیں۔ چہرہ کا رنگ اُٹ گیا۔ سر جوئی سے گڑگڑا کر بولا میں کہاں جاؤں۔ سر جوئی کے آپ ہی ہوش اڑے ہوئے تھے۔ گھبراہٹ میں زبان سے کچھ بات نہ نکلے۔ اتنے میں مالی نے پھر بغیر کھٹکھٹائی۔ بچاری سر جوئی بے بس تھی۔ اسنے ڈرتے ڈرتے کواڑ کھول دیا۔ کھلا چرن ایک کونے میں دبک کر کھڑا ہو گیا۔ جس طرح بھینٹ کا بکرا کٹار کے تلے ترپتا ہے۔ اسی طرح کونے میں کھڑے ہو گیا۔ لکڑی کا دل اسوقت ترپ رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی سے مایوس تھا۔ اور ایشور کو صدق دل یاد کر کے کہہ رہا تھا کہ اگر ابھی اس مصیبت سے رہا ہو جاؤں تو پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرؤں گا۔ اتنے میں مالی کی نگاہ حضرت پر پڑی۔ پہلے تو کچھ گھبرا یا۔ پھر نزدیک آکر بولا یہ کون کھڑا ہے یہاں کیون ہے؟

اتنا سننا تھا کہ کھلا چرن تیزی سے باہر نکلا۔ اور پچائک کی طرف بٹٹ بھاگا۔ مالی ایک ڈنڈا ہاتھ میں لئے کینا لینا بھاگنے نہ پاوے کے نعرے مارتا پیچھے پیچھے ہوتا۔ یہ وہی کھلا ہے جو مالی کو التام و اکرام دیا کرتا تھا۔ ادھر سے مالی سرکار اوجھڑو

لکھن باتیں کرتا تھا۔ وہ کھلا آج اُسی مالی کے سامنے اس طرح جان بچا کر بھاگا جاتا ہے۔
گناہ آگ کا وہ کندہ ہے جو عزت و حرمت۔ حوصلہ و ہمت کو دم زدن میں جلا کر رکھ
کر دیتا ہے۔

کھلا چرن درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں دوڑتا ہوا پھاٹک سے باہر نکلا۔
سڑک پر ٹریم جا رہی تھی۔ اسپر جا بیٹھا۔ اور ہانپتے ہا پنتے بیدم ہو کر گاڑی کے تختہ پر
بدحواس گر پڑا۔ اگرچہ مالی نے پھاٹک تک بھی پیچھا نہ کیا۔ مگر کھلا ہر ایک آنے جانے والے
پر چونک چونک کر نکلا پس ڈالتا۔ گویا سارا زمانہ اُس کا دشمن ہو گیا ہے۔ کبھی نے ایک
اور گل کھلایا۔ اسٹیشن پر پہنچتے ہی گھبراہٹ کا مارا ریل گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ مگر
کلٹ لینے کی سندھی۔ اور نہ معلوم ہوا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ وہ اس وقت اس شہر سے
بھاگنا چاہتا تھا۔ خواہ کبھی ہو۔ کچھ دور چلا تھا کہ ایک انگریزی لائبریری لائٹن لئے آتا دکھائی
دیا۔ اُسکے ساتھ ایک کنسٹبل بھی تھا۔ وہ مسافروں کا کلٹ دیکھتا چلا آتا تھا۔ مگر کھلا نے
سمجھا پولیس کا کوئی افسر ہے خوف کے مارے ہاتھ پاؤں سنسنانے لگے۔ اور کلیچ میں
دھرکن ہونے لگی۔ جب تک وہ دوسری گاڑیوں میں معاینہ کرتا رہا تب تک تو وہ کلیچ مضبوط
کئے بیٹھا رہا۔ مگر جوں ہی اُسکے کمرہ کا دروازہ کھلا کھلا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔
آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ ایک وحشت کے عالم میں دوسری طرف
کا دروازہ کھول کر چلتی ہوئی ریل پر سے نیچے کود پڑا۔ کنسٹبل اور کلٹ والے صاحب نے
اُسے یوں کودتے دیکھا تو سمجھ کوئی مشتاق ڈاکو ہے۔ مارے خوشی کے پھولے زمانے
کہ انعام الگ ملیگا اور ترقی اوپر سے ہوگی۔ فوراً سرج لائٹن دکھائی۔ ذرا دیر میں گاڑی
رک گئی۔ اب گاڑی اور کانسٹبل اور کلٹ والے صاحب مع چند دوسرے آدمیوں کے

گاڑی سے اتر پڑے۔ اور لالٹین بے لے کر ادھر ادھر تلاش کرنے لگے کسی نے نہ پایا تھا۔ گرد بھی نہیں ملنے کا۔ پکا ڈکیت تھا۔ کوئی بولا لا این لوگوں کو کالی جی کا ایشٹ رہتا۔ جو کچھ نہ کر دکھائیں تھوڑا ہے۔ مگر کارڈ آگے ہی بڑھتا گیا۔ ترقی کی امید اُسے آگے لئے جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس مقام پر پہنچا جہاں کملا گاڑی سے کودا تھا۔ اتنے میں کانسٹیبل نے خندق کی طرف اشارہ کر کے کہا دیکھو وہ سفید سفید کیا چیز ہے۔ مجھے تو کوئی آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اور لوگوں نے بھی دیکھا اور یقین ہو گیا کہ ضرور ہی بد معاش یہاں چھپا ہوا ہے۔ چلکر بچہ کو گھیر لو کہ کہیں نکلنے نہ پاوے۔ ذرا سنبھلے ہوئے رہنا۔ ڈاکو جان پر کھیل جاتے ہیں سگار ڈم صاحب نے سپتول سنبھالا۔ میاں کانسٹیبل نے لالٹنی تانی۔ چند مسافروں نے جوتے اُتار اُتار کر ہاتھوں میں لئے کہ کہیں دائرہ بٹھما تو بھاگنے میں آسانی ہوگی۔ دو چار آدمیوں نے ڈھیلے اٹھائے کہ دور ہی سے نشانہ لگائیں گے۔ ڈاکو کے نزدیک کون جاوے۔ کسے جان بھاری پڑی ہے۔ مگر جب لوگوں نے نزدیک جا کر دیکھا تو نہ ڈاکو۔ نہ ڈاکو کا بھائی۔ بلکہ ایک شریفین صورت۔ سبزہ آغاز۔ چھیریرے بدن کا نوجوان بے حس و حرکت زمین پر اوندھے مُنہ پڑا ہے۔ اور اُسکے ناک اور کان سے آہستہ آہستہ خون بہہ رہا ہے۔ برجین کا لال سر جو دیہی نے چھین کر زمین پر ٹپک دیا۔ کملا نے ادھر دم توڑا۔ اور برجین ایک بھیانک غواب دیکھ کر چونک پڑی۔ سر جو دیہی نے برجین کا سماگ لوٹ لیا۔ شرابِ محبت کا دودھ ایسا بند ہوا کہ نہ ساقی رہا۔ نہ ساغر۔ سب خاک میں لگئے۔

۱۴۰ میسوین فصل

ہجومِ غم

سہاگن عورت کے لئے اُسکا شوہر دنیا کی سب سے پیاری چیز ہوتی ہے۔ وہ اُسی کے لئے جیتی ہے۔ اور اُسی کے لئے مرتی ہے اُسکا احسننا بولنا اُسکو خوش کرنے کے لئے۔ اور اُسکا بناؤ سنگار اُسکے لُبھانے کے لئے ہوتا ہے۔ اُسکا سہاگ اُسکی مسرت اور زندگی ہے۔ اور سہاگ کا اٹھ جانا اُسکی زندگی اور جانداری کا خاتمہ۔

کلا چرن کی بیہ ہنگام موت برج رانی کے لئے موت سے کم نہ تھی۔ اُسکی زندگی کی آرزوئیں اور ولوے سب مٹی میں گلے کیا کیا ادا دے تھے۔ اور کیا ہو گیا۔ ہر دم مرتوا کی صورت اُسکی آنکھوں میں پھر اُرتی تھی۔ اگر فردیر کے لئے آنکھیں جھپک جاتیں تو اُسکی تصویر ہو ہو آنکھوں کے سامنے آجاتی۔

بعض اوقات ارضی و سماوی کو کسی خاص شخص یا خاندان سے انس سا ہوتا ہے۔ کلا چرن کا داغ مرجھانے بھی نہ پایا تھا کہ بابوشیا ماچرن کی باری آپہنچی۔ شاخوں کے کاٹنے سے درخت کو مرجھاتے نہ دیکھ کر ابکی آسمان نے جڑ ہی کاٹ دی۔ رام دین پانڈے بڑا کینہ ور شخص تھا۔ جب تک ٹوٹی صاحب مجگا لڑوں میں تھے دبا بیٹھا رہا۔ مگر جوں ہی وہ شہر کو لوٹے اسی دن سے اُس نے او دھم مچا ناشر دوع کر دیا۔ سارا گالوں کا گالوں اُسکا دشمن تھا۔ جن نگاہوں سے مجگا لڑوں والوں نے ہولی کے دن اُسکی نظر دیکھتا تھا وہ نگاہیں۔ اور وہ تیور اُسکے کلیجہ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے۔ جس ملکہ میں مجگا لڑوں واقع تھا اُسے تھانہ دار صاحب ایک بڑے گھاگ۔ آنموہہ کار راشی تھے۔

ہزاروں کی رقمیں ہضم کر جائیں۔ مگر ڈاکار تک نہ لیں۔ مقدمے بنانے اور ثبوت پہنچانے میں ایسے مشاق کر راہ چلتے آدمی کو پھانس دیں۔ اور پھر کسی کے چھوڑے نہ چھوڑے۔ احکام سب اُنکے صمٹکنڈوں سے واقع تھے۔ مگر اُنکی ہوشیاری۔ اور معاملہ دانی کے مقابلہ میں کسی کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔ راجدین ان تھانہ دار صاحب سے ملا۔ اور اپنے زخم جگر کی دوا مانگی۔ اسکے ہفتہ بھر بعد مجگانوں میں ڈاکہ پڑ گیا۔ ایک مہاجن شہر سے آ رہا تھا۔ رات کو نمبر دار کے یہاں ٹھہرا۔ ڈاکوؤں نے اُسے لوٹکر گھر نہ جانے دیا۔ صبح کو تھانہ دار صاحب تحقیقات کو آئے۔ اور ایک ہی رسی میں سارے گانوں کو باندھ لیگئے۔

حسن اتفاق سے مقدمہ بابوشیا ماچرن کے اجلاس میں پیش ہوا۔ اُنھیں پہلے ہی سے سارا کچا چٹھا معلوم تھا۔ اور یہ تھانہ دار صاحب بہت دنوں سے اُنکی آنکھوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے ایسی ایسی موٹگنیاں کیں۔ اور ایسے ایسے نکتے لنگالے کہ تھانہ دار صاحب کی قلعی کھل ہی گئی۔ چھ مہینہ تک مقدمہ چلا۔ اور دھوم سے چلا۔ سرکاری وکیلوں نے بڑے بڑے زور لگائے۔ مگر گھر کے بھیدی سے کیا چھپ سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈپٹی صاحب نے سب ملازموں کو بے داغ رہا کر دیا۔ اور اُسی دن شام کو تھانہ دار صاحب معطل کر دیئے گئے۔

جب ڈپٹی صاحب فیصلہ سنا کر لوٹے تو ایک ہمدرد اہلکار نے کہا حضور تھانہ دار صاحب سے ذرا ہوشیار رہیگا۔ آج بہت جھلایا ہوا تھا۔ پہلے بھی دو تین افسروں کو زک دیکھا ہے۔ آپ پر ضرور وار کریگا۔ ڈپٹی صاحب نے سنا اور مسکرا کر اُس آدمی کا شکریہ ادا کیا۔ مگر اپنی حفاظت کے لئے کوئی مزید انتظام نہ کر سکے۔ اُنھیں یہ بزدلانہ خیال معلوم ہوتا تھا۔ رادھا امیر بہت عند کرتا رہا کہ میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ کاشی بھر جی

بہت پیچھے پڑا رہا۔ مگر انھوں نے کسیکو ساتھ نہ رکھا۔ اور حسب معمول اپنا فرض انجام دیتے رہے۔

ظالم خاں بات کا دھنی تھا۔ وہ زندگی سے ہاتھ دھو کر بالوشیا ماچرن کے پیچھے گیا۔ ایک روز وہ سیر کر کے شیوپور سے کچھ رات گئے واپس آ رہے تھے کہ پاگل خانہ کے قریب کچھ دیکھ کر فٹن کا گھوڑا پد کا۔ گاڑی رُک گئی۔ اور دم زدن میں ظالم خاں نے ایک درخت کی آڑ سے نکل کر ہسپتال کا نشانہ لگایا۔ پٹاخے کی آواز ہوئی۔ اور بالوشیا ماچرن کے سینے سے گولی پار ہو گئی۔ پاگل خانہ کے گارڈ کے سپاہی دوڑے۔ اور ظالم خاں کو گرفتار کر لیا۔ سائیس نے اُسے بھاگنے نہ دیا تھا۔

اس حادثہ نے خاندان کی تباہی کا سامان پورا کر دیا۔ پریمیوتی یوں تو بہت نیک مزاج اور محنتی عورت تھی۔ مگر ان حادثات نے اُسکے مزاج اور برتاؤ میں بیکار بڑی تبدیلی پیدا کر دی۔ اُسکے حواس میں فرق آگیا۔ بات بات پر برجن سے چڑھ جاتی۔ اور طعنے مارنے لگتی۔ اُسے خدا جانے کیونکر یہ دم ہو گیا تھا کہ یہ سب آفت اسی بہو کی لائی ہوئی ہے۔ یہی سبز قدم جب سے گھر میں آئی گھر ستیا ناس ہو گیا۔ اسکا پورا خراب ہے۔ کئی دفعہ اُس نے کھو لکر برجن سے کہہ بھی دیا۔ کہ تمہاری حکمی صورت نے مجھے موہ لیا۔ میں کیا جانتی تھی کہ تمہارے چرن ایسے منحوس ہیں۔ برجن یہ باتیں سنتی۔ اور کلیجہ مسل کر رہ جاتی۔ جب دن ہی برے آگئے تو بھلی باتیں کیونکر سننے میں آئیں۔ یہ اٹھوں پہر کی کوفت اُسے سرسرت کے آئینہ بھی نہ بھانسنے دیتی۔ آئینہ نکلتے ہیں جب کوئی ہمدرد ہو اور دلسوزی کرے۔ کوفت اور لعن طعن کی آگ سے آئینہ خشک ہو جاتا ہے۔

روز برجن کا جی گھر میں بیٹھے بیٹھے ایسا گھبراہٹ کا وہ ذرا دیر کے لئے باغی میں

چلی آئی۔ آہ اس باغچہ میں کیسے کیسے لطف کے دن گزرے تھے۔ اسکا ایک ایک پھول
 مرنے والے کی محبت بیکراں کا یادگار تھا۔ کبھی وہ دن بھی تھے کہ ان پھولوں اور پتوں کو
 دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا تھا۔ اور نسیم دل پر غموں کا نشہ پیدا کر دیا کرتی تھی۔ یہی وہ مقام
 ہے جہاں بہت سی شاہیں آغوش الفت میں گزری تھیں اور جہاں شراب محبت کے دور
 چلے تھے۔ اسوقت پھولوں کی پنکھڑیاں اپنے نازک نازک ہونٹوں سے اسکا خیر مقدم
 کرتی تھیں۔ مگر انوس! آج انکے سر جھکے ہوئے تھے۔ اور زبانی بند تھیں۔ کیا یہ وہ جگہ
 نہ تھی جہاں اَلِیْلِی مالن پھولوں کا ہار گوندھتی تھی۔ مگر بھولی مالن کو کیا معلوم تھا کہ اسی جگہ
 اُسے اپنی آنکھوں سے نکلے ہوئے موتیوں کے ہار گوندھنے پڑ گئے۔ انھیں خیالوں میں
 برجن کی نگاہیں اُس کنج کی طرف اٹھ گئیں جہاں سے ایک بار کلا چرن مسکراتا ہوا نکلا تھا۔
 گویا وہ پتیوں کی جنبش اور اسکے کپڑوں کی جھلک دیکھ رہی ہے۔ اسکے چہرے پر اسوقت
 ہلکی سی مسکراہٹ نمودار تھی۔ جیسے گنگائیں ٹوڑتے ہوئے آفتاب کی زرد اور ملین کرنوں
 کا عکس چڑتا ہے۔ بیکایک پریوتی نے آکر گرفت آوازیں کہا اُب آپ کو سیر کر نیکا شوق
 چڑایا ہے؟“

برجن کھڑی ہو گئی اور روتے ہوئے بولی۔ ”اماں جے ناراین نے کچلا اُسے
 آپ کیا کچلتی ہیں“

آخر پریوتی شہر سے ایسی بیزار ہوئی کہ ایک مہینہ کے اندر سب سامان اولے پوسنے
 بیچ کر جگالوں چلی گئی۔ برج رانی کو ساتھ نہ لیا۔ اُسکی صورت سے اُسے نفرت ہو گئی تھی۔
 برجن اس وسیع مکان میں اکیلی۔ ہانگی مادھوی کے سوا اب اسکا کوئی غمخوار نہ تھا۔ سب باماکو
 اپنی منہ بولی بیٹی کی مصیبتوں کا اتنا ہی صدمہ ہوا۔ جتنا اپنی بیٹی کا ہوتا۔ کئی دن تک روتی رہی۔

اور کئی دن برابر اُسے سمجھانے کے لئے آتی رہی۔ جب برج اکیلی رہ گئی تو سببامانے چاہا کہ یہ میرے یہاں اُٹھ آئے۔ اور آرام سے رہے۔ خود کئی بار بلائے گئی۔ متری جی کو بھیجا۔ مگر برج کی طرح اسے پر آمادہ نہ ہوئی۔ اُسے خیال ہوتا تھا کہ سُسُرو کو دنیا سے سدھارے ابھی تین مہینہ بھی نہ ہوا اتنی جلد یہ مکان خالی ہو جائیگا تو لوگ کہیں گے کہ اُنکے مرتے ہی ساس اور بہو لڑھکیں۔ یہاں تک کہ اُسکی اس ضد سے سبباماکا من موٹا ہو گیا۔

مہنگاؤں میں پریوتی نے ایک اندھیر مچا رکھا تھا۔ اسامیوں کو سخت صحت کمتی۔ کارندہ کے سر پر جوتی پٹندی۔ پٹاری کو کوسا۔ رادھا اہیر کی گائے زبردستی لے لی۔ یہاں تک کہ گائوں والے گھبرا گئے۔ اور بالورا دھاپرن سے شکایت کی۔ رادھا چرن نے یہ کیفیت سنی تو یقین ہو گیا کہ ضرور ان صدقات نے اسکے حواس زایل کر دیے ہیں۔ اسوقت کسی طرح انکا دل ہلانا چاہئے۔ سیوتی کو لکھا کہ تم ماں کے پاس چلی آؤ۔ اور اُسکے ساتھ کچھ دنوں رہو۔ سیوتی کی گود میں اسوقت ایک چاند سا بچہ کھیل رہا تھا۔ اور پران نامقہ دو مہینہ کی رخصت لیکر در بھنگ سے لوٹے تھے۔ راجہ صاحب کے پرائوٹ سٹری ہو گئے تھے۔ ایسے موقع پر سیوتی کیونکر آسکتی۔ تیاریاں کرتے کرتے مہینوں گزر گئے۔ کبھی لڑکا بیمار پڑ گیا۔ کبھی ساس روٹھ گئی۔ کبھی سماعت نہ بنی۔ آخر چھٹویں مہینہ جا کے اُسے فرصت ملی۔ اور وہ بھی بڑی منتوں کے ساتھ۔

مگر پریوتی پر اُسکے آنے کا مطلق اثر نہ ہوا۔ وہ اُسکے گلے ملکر بھی نہ دیتی۔ اُسکے بچے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اُسکے دل میں اب محبت اور انسانیت نلکم کو بھی باقی نہ رہی تھی۔ جیسے گتے سے رس نکال لو تو صرف مُصلد رہ جاتا ہے۔ اُسی طرح جس انسان کے دل سے محبت نکلے گی وہ گوشت و پوست کا ایک تودہ رہ گیا۔ دیوی دیوتا کا نام زبان پر آتے ہی اُسکے

تیو بد دل جاتے تھے۔ جگکانوں میں جنم اسٹی ہوئی۔ لوگ ٹٹھا کر جی کا برت رکھے ہوئے تھے۔ اور چندہ سے نایج کرانیکی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مگر پرمیوتی نے عین جنم کے موقع پر اپنے گھر کی مورتی مکھیت میں پھنکوا دی۔ ایکادسی برت چھوٹا۔ دیوتاؤں کی پوجا چھوٹی۔ وہ پرمیوتی اب پرمیوتی ہی نہ تھی۔

سیوتی نے جوں توں کر کے یہاں دو مہینہ کاٹا۔ اُسکی طبیعت بہت گھراتی۔ کوئی سکھی سہیلی بھی نہ تھی جسکے ساتھ ٹیکھرون کاٹتی۔ برجن نے تسلا کو اپنی سکھی بنالیا تھا۔ مگر سیوتی کا مزاج امیرانہ واقع ہوا تھا۔ ایسے عورتوں سے میل جول وہ اپنے لئے باعث سنگ سمجھتی تھی۔ تسلا یہ چاری کئی بار آئی۔ مگر جب دیکھا کہ یہ دل کھول کر نہیں ملتی تو آنا جانا چھوڑ دیا۔

تین مہینہ گذر چکے تھے۔ ایک روز سیوتی دن چڑھتے تک سوتی رہی۔ پران نامتھ نے رات کو بہت رلایا تھا۔ جب نیند کھلی تو کیا دیکھتی ہے کہ پرمیوتی اُسکے پیچھے لوگوں میں لئے جو رہی ہے۔ کبھی آنکھوں سے لگاتی ہے۔ اور کبھی چھاتی سے چٹاتی ہے۔ سانسے انگلیٹھی پر ہٹا پک رہا ہے۔ بچہ اُسکی طرف انگلیوں سے اشارہ کر کر کے اُچکتا ہے کہ کورے میں جا بیٹھوں۔ اور گرم گرم حلوا چکھوں۔ آج اُسکا چہرہ کنول کی طرح کھلا ہوا ہے۔ شاید اُسکی تیز نگاہوں نے ٹاٹ لیا ہے کہ پرمیوتی کے اُجڑے ہوئے دل میں پریم نے آج پھر باس کیا ہے۔ سیوتی کو یقین نہ آیا۔ چار پانی پر پڑے پڑے نیم باز آنکھوں سے تاک رہی تھی۔ گویا خواب دیکھ رہی ہے۔ اتنے میں پرمیوتی پیار سے بولی۔

”بیٹی اٹھو۔ دن چڑھ آیا۔“

سیوتی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور آنکھیں بھرا آئیں۔ آج بہت دنوں کے بعد ماں کے منہ سے محبت کی باتیں سنیں۔ جھٹ اٹھ بیٹھی۔ اور ماں کے گلے پٹٹ کر رونے لگی۔ پرمیوتی کی آنکھوں سے بھی آنسو کی چھڑی لگ گئی۔ سوکھلیڑ ہرا ہوا۔ جب دو دنوں کے آنسو تھے تو پرمیوتی

بولی "ستو۔ تمہیں آج یہ سب باتیں اپہرج معلوم ہوتی ہیں۔ ہاں بیٹی اب اپہرج ہی ہیں۔
 میں کیسے روؤں جب آنکھوں میں آنسو ہی نہیں رہے۔ پیار کہاں سے لاؤں جب کلہمہ سوکھ کے پتھر
 ہو گیا۔ یہ سب دنوں کے پھر ہیں۔ آنسو انکے ساتھ گئے۔ اور پیار کما کے ساتھ۔ آج نہ جانے
 یہ دو بوند کہاں سے نکل آئے۔ بیٹی میری خطائیں سب معاف کرنا۔"

یہ کہتے کہتے اُسکی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ سیوتی زرد ہو گئی۔ ماں کو فرس پر لٹا دیا۔ اسدن
 سے پریمیوتی کا یہ حال ہو گیا جب دیکھو وری ہے۔ باتیں کرتی تو شکر و فند گھول دیتی۔ بچے کو گود
 سے ایک دم کے لئے الگ نہ کرتی۔ مہربوں سے بولتی تو نندہ سے پھول جھڑتے۔ پھر پھلے کی پریمیوتی
 ہو گئی۔ شیریں زبان۔ رحم دل اور نیک۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسکے دل پر سے ایک پردہ سا
 اٹھ گیا۔ جب شدت کی برف پڑتی ہے تو بعض ندیاں بچ بستہ ہو جاتی ہیں۔ تب انہیں بسنے والی
 پمچھلیاں اور دریا بانی جانور چارو برف میں چھپ جاتے ہیں۔ کشتیاں بچنس جاتی ہیں اور اخ فرس
 سیم تن۔ جان نواز چشما ب کی صورت بالکل نظر نہیں آتی۔ حالانکہ برف کی چادر سے نیچے وہ خواب
 ناز میں مست پڑا رہتا ہے۔ مگر جب گرمی کا راج ہوتا ہے تو برف کھل جاتی ہے۔ اور دریاے سینن
 برف کی چادر اٹھا دیتا ہے۔ پھر پمچھلیاں اور جانور آتے ہیں کشتیوں کے بادبان لہانے لگتے ہیں
 اور اسکے ساحل پر مردم و مرغ و مور کا بگھٹ ہو جاتا ہے۔

مگر یہ کیفیت زیادہ دنوں تک نہ قائم رہی۔ ایک ہی ہفتہ میں پریمیوتی کی حالت نازک
 ہو گئی۔ مزاج کا صحیح ہونا گویا موت کا پروانہ تھا۔ اسی مدہوشی نے اُسے اتنی قید حیات میں رکھا
 تھا۔ ورنہ پریمیوتی جیسی نرم دل عورت باوجود حادث کے ایسے جھونکے نہ برداشت کر سکتی۔

سیوتی نے چارہ نظرات مار دلو اسے کہ اگر آماں کو دیکھ جاؤ۔ مگر کہیں سے کوئی نہ آیا۔
 پران ناٹھ کو رخصت نہ ملی۔ برجن بیمار تھی۔ رہے رادھا سپرن۔ وہ

نبی تال سیر کرنے گئے ہوئے تھے۔ پریمی کو بیٹے ہی کے دیدار کا اشتیاق تھا۔ مگر جب اُنکا خط آگیا کہ میں اس وقت نہیں آ سکتا۔ تو اُس نے ایک لمبی سانس لی۔ اور اُنکھیں موند لیں۔ اور ایسی سوتی کہ پھر اُنکھنا نصیب نہوا۔

اکیسویں فصل

نفس کی سرکشیاں

انسان کا دل ایک راز سر رہی ہے۔ کبھی تو وہ لاکھوں کی طرت اُنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ اور کبھی چند بیٹیوں پھیل جاتا ہے۔ کبھی صد ہا بیگناہوں کے خون پُراف تک نہیں کرتا۔ اور کبھی ایک بچے کو دیکھ کر رو دیتا ہے۔ پرتاپ چند را اور کمالا چرن میں اگرچہ برادرانہ محبت تھی۔ مگر کمالا کی موت بے ہنگام کا جو صدمہ پرتاپ کو ہونا چاہئے وہ نہوا۔ سُنکر وہ چونک ضرور پڑا۔ اور زور دیر کے لئے مغموم بھی نظر آیا۔ مگر وہ ملال جو کسی شخص کو اپنے پیچھے دوست کی وفات پر ہوتا ہے اُسے نہوا۔ یہیں شک نہیں کہ شادی کے پہلے ہی سے اُس نے برجن کو اپنی بہن سمجھنا شروع کیا تھا۔ تاہم اس خیال میں اُسے پوری کامیابی کبھی نہ حاصل ہوئی۔ وقتاً فوقتاً اس کا واہمہ اس پاک رشتہ کے حدود سے بہت آگے بڑھ جاتا تھا۔ کمالا چرن سے اُسے بذات خاص کوئی ایسی محبت نہ تھی۔ اُسکی جو کچھ خاطر مدارات اور محبت وہ کرتا وہ کچھ تو اس خیال سے کہ برجن سُنکر خوش ہوگی۔ اور کچھ اس خیال سے کہ سوسیلہ کے موت کا کفارہ اسی طرح ادا ہو سکتا ہے جب برجن سسرال چلی آئی تو البتہ کچھ دنوں تک پرتاپ نے اُسے اپنے خیالات میں نہ آنے دیا۔ مگر جبر وقت سے کہ وہ اُسکی پیاری کی خبر پا کر بنارس گیا تھا۔ اور اُسکے ملاقات نے

داروے شفا کا کام کیا تھا اس وقت سے پرتاپ کو یقین ہو گیا تھا کہ برجن کے دل میں کلمہ لگانے وہ جگہ نہیں پائی جو میرے لئے مخصوص تھی۔

پرتاپ نے برجن کو نہایت پروردگار نامہ لکھا۔ مگر خط لکھتا جاتا تھا۔ اور سوچتا جاتا تھا کہ اس کا اسپر کیا اثر ہو گا۔ بالعموم ہمدردی محبت کو مضبوط کرتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ یہ خط ہی اپنا کام کر جائے۔ علاوہ اسکے چونکہ وہ ذرا مذہبیت کی طرف زیادہ مائل تھا کلمہ کی موت نے یہ خیال پیدا کیا کہ الی شوری نے میری محبت کی قدر کی اور کلمہ چرن کو میرے راستہ سے ہٹا دیا۔ گو یہ غیب سے پروانہ ملا ہے کہ اب میں برجن سے اپنی محبت کی داد لوں۔ پرتاپ یہ تو جانتا تھا کہ برجن سے کسی ایسے بات کی امید کرنا جو اخلاق اور صداقت کے راستہ سے جو بھر بھی ہٹی ہوئی ہو حاق ہے۔ مگر اخلاق اور صداقت کے دائرہ میں رہتے ہوئے میری خاطر داری اور ولہی اگر ممکن ہے تو برجن زیادہ عرصہ تک میرے ساتھ بیڑی نہیں کر سکتی۔ جب میں آنکھوں میں آنسو بھر کر۔ اور عاجزی سے منت کروں گا تو وہ غور و بری طرف مخاطب ہو جائیگی۔ اور وقت محبت اور عاشقانہ خاطر داریاں اپنا اپنا کام پورا کر کے رہیں گی۔

ایک مہینہ تک یہ خیالات اسے پیچیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ برجن سے ایک بار پوشیدہ ملاقات کرنے کا بیٹا باند اشتیاق اسے پیدا ہوا۔ یہ وہ جانتا تھا کہ ابھی برجن کے دل پر تازہ صدمہ ہے۔ اور میری کسی بات یا انداز سے اگر میرے نفس کی سرکشوں کی بوغلی تو پھر برجن کے نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے گرجاؤں گا۔ مگر جیسے کوئی چور روپیہ کا ڈھیر دیکھ کر صبر نہیں کر سکتا۔ اسی طرح پرتاپ اس وقت اپنے تئیں تھام نہ سکا۔ انسان کی قسمت ایک بڑی قوتوں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ موتھے اُسے نیک بھی بناتے ہیں اور بد بھی۔ جب تک

کھلا چرن زندہ تھا پرتاپ کے نفس کو کبھی اتنا سرا بھارنے کا موقع نہ ملا۔ اسکی موت نے گویا جگہ خالی کر دی۔ یہ خود غرضی کا نشہ یہاں تک بڑھا کہ ایک روز اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ برجن مجھے یاد کر رہی ہے۔ اپنی بیٹابی سے وہ برجن کی بیٹابی کا اندازہ لگانے لگا۔ بنارس جانے کا ارادہ مصمم ہو گیا۔

دو بجے رات کا وقت تھا۔ چاروں طرف موت کا سنا سنا مچھایا ہوا تھا۔ نیند نے سارے شہر پر ایک گھٹا ٹپ چادر پھیلا دی تھی۔ کبھی کبھی پیڑوں کی سننا ہٹ سنائی دیتی تھی۔ دھواں نکالوں اور درختوں پر ایک سیاہ غلات کی طرح لپٹا ہوا تھا۔ اور شرک کی لالٹیں دھوئیں کی سیاہی میں ایسی نظر آتی تھیں جیسے بادلوں میں چھپے ہوئے تارے۔ پرتاپ چند ریل گاڑی سے اُترا تو اُسکا دل بانسو اچھل رہا تھا۔ اور ہاتھ پاؤں کانپتے تھے۔ یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ گناہ کا اُسے تجربہ ہوا۔ افسوس کہ دل کی یہ کیفیت عرصے تک قائم نہیں رہتی۔ نفس اس منزل دشوار کو طے کر لیتا ہے۔ جس شخص نے کبھی شراب نہیں پی۔ اُسے اسکی بوسے نفرت ہے۔ شاید پہلی بار وہ پیگیا تو گھنٹوں اُسکا منہ بد مزہ رہیگا۔ اور وہ تعجب کریگا کہ کیوں لوگ ایسی ہٹی اور کڑوی چیز کے ایسے گرویدہ ہیں۔ مگر چند ہی دنوں میں اُسکی نفرت غائب ہو جاتی ہے۔ اور وہ بھی اب سرخ کا غلام ہو جاتا ہے۔ گناہ کا مزہ شراب سے بہت زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ پرتاپ چند اندھیرے میں آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ اُسکے قدم جلد نہیں اُٹھتے تھے کیونکہ گناہ نے اُسکے پیروں میں پڑیاں ڈال دی تھیں اُس دلوں آئینہ مسرت کا جو ایسے موقوف ہر قدم کو تیز کر دیتی ہے اُسکے چہرہ پر کوئی نشان نہ تھا۔ وہ چلتے چلتے ٹک جاتا۔ اور پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھتا تھا۔ شیطان اُسے گناہ کے غار میں کیسا کھینچنے لے جاتا ہے۔

پرتاپ کا سر دھم دھم کر رہا تھا۔ اور خون سے پنڈلیاں کانپ رہی تھیں۔ سوچتا بچا رہا۔

گھنٹہ بھر میں وہ منشی شیاماچرن کی عالی شان حویلی کے سامنے سکے جا پہنچا۔ آج تاریکی میں یہ حویلی بہت ہی بھیاںک معلوم ہوتی تھی جیسے گناہ کا بھوت سامنے کھڑا ہو۔ پرتاپ دیوانکی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ کسی نے اُسکے پیر باندھ دیئے۔ آدھ گھنٹہ تک وہ یہی سوچا کہ لوٹ چلوں۔ یا اندر جاؤں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائیگا۔ برجن مجھے دیکھ کر دل میں کیا سوچے گی۔ کمین ایسا نہ کہ میری یہ حرکت مجھے ہمیشہ کے لئے اُسکی نظروں سے گرا دے۔ گر ان سب اندیشوں پر شیطان کی کشش غالب آئی۔ انفس کی بس میں ہو کر انسان کو نیک و بد کی تمیز نہیں باقی رہ جاتی۔ اُسنے دل کو مضبوط کیا۔ اور اس بُر دلی پر اپنے تئیں ماست کرنے لگا۔ بعد ازاں مکان کے عقب کی طرف جا کر باغچہ کی چار دیواری سے اندر بھاگ پڑا۔ باغچہ سے مکان کے اندر جانے کے لئے ایک چھوٹا دروازہ تھا۔ اتفاق سے وہ اسوقت کھلا ہوا تھا۔ پرتاپ کو اسوقت یہ ایک خال نیک سامعہ ہوا۔ مگر فی الواقعہ یہ خانہ مصیبت کا دروازہ تھا۔ اندر جاتے ہوئے پرتاپ کے ہاتھ پاؤں ٹھکرتھکرتے لگے۔ دل میں ایسی غضب کی دھڑکن تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ سینہ سے باہر نکل پڑے گا۔ اُسکا دم گھٹتا تھا۔ ایمان نے ابکی بہت زور لگایا۔ اپنی ساری قوت صرف کر دی۔ مگر انفس کا پُر زور دھاوا نہ رک سکا۔ پرتاپ دروازہ کے اندر داخل ہوا۔ اور آنگن میں تلخی کے چبوترہ کے پاس۔ چوروں کی طرح کھڑا سوچنے لگا کہ برجن سے کیونکر ملاقات ہو۔ مکان کے سب دروازے بند ہیں۔ کیا برجن بھی یہاں سے چلی گئی۔ کیا ایک اُسے ایک بند دروازہ کے درازوں سے ہلکی روشنی کی شعل دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی اُسکے جگر نے ایسی قلعج بھری گویا ہوا میں اڑ جائیگا۔ دبے پاؤں اسی طرف چلا۔ اور دراز میں آنکھ لگا کر اندر کی کیفیت دیکھنے لگا۔ اُسکی سانس اسوقت بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔

برجن ایک سفید ساڑی پہنے۔ چہرہ زرد۔ بال کچھڑے ہوئے۔ فرش پر ہاتھ میں

قلم لئے بیٹھی تھی۔ اور دیوار کی طرف دیکھ دیکھ کر غنڈ پر کچھ لکھتی جاتی تھی۔ جیسے کوئی شاعر بحر خیال سے موتی نکال رہا ہو۔ قلم کو دانتوں سے دبا کر کچھ سوچتی اور لکھتی۔ اور ذرا دیر کے بعد دیوار کی طرف تانے لگتی۔ پرتاپ بہت دیر تک سانس روکے ہوئے یہ دلچسپ نظارہ دیکھتا رہا۔ نفس اُسے بار بار تھوکے دیتا۔ مگر یہ ایمان کا آخری قلعہ تھا۔ اس وقت ایمان کا ٹھکست کھا جانا گویا پہلو سے دل میں شیطان کا جگمہ پانا تھا۔ ایمان اور نتائج کے خون نے اس وقت پرتاپ کو اس غار میں گرنے سے بچا لیا جہاں سے مرتے دم تک اُسے نکلنا نصیب نہوتا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ غارِ معصیت سے بچا نہ والا اس وقت ایمان نہ تھا۔ بلکہ نتائج کا خوف اور پشیمانی کا خیال۔ بسا اوقات جب ہمارا ایمان مغلوب ہو جاتا ہے تو نتائج کا خوف ہلکو ہکر داریوں سے بچا لیتا ہے۔ برجن کے چہرہ پر باوجود زردی کے ایک ایسی رونق تھی جو قلب کی صفائی اور خیال کے بلندی کا پتہ دیر ہی تھی۔ اُسکے بشرے کی منانت اور نگاہ کی پاکیزگی میں نفس سرکش کے لئے وہ جانگذا نمازیہ تھا جس سے پرتاپ کے نفس کا جانبر ہونا محال تھا۔ کیونکہ راہِ معصیت میں اُسکا یہ پہلا سفر تھا۔ وہ ایسا موثر ہوا کہ رونے لگا۔ نفس نے جتنے خیالات فاسد اُسکے دل میں پیدا کر دیئے تھے وہ سب اس نظارہ نے یوں غائب کر دیئے جیسے اُجالا اندھیرے کو دور کر دیتا ہے۔ اس وقت اُسے یہ خواہش ہوئی کہ ایسے پیروں پر گر کر اپنے خطائوں کی معافی مانگ لوں۔ جیسے کسی مہاتما سنیاسی کے روبرو جا کر ہمارے دل کی کیفیت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پرتاپ کے دل میں خود بخود اعزاز و احترام کے خیالات پیدا ہوئے۔ وہ اپنی اخلاقی پستی پر ایسا نادم ہوا کہ برہمن کے سامنے جانے کی ہمت نہ پڑی شیطان یہاں تک لایا۔ مگر اگے نہ لیجا سکا۔ وہ اُسٹے قدم لٹا دیا ایسی تیزی سے باغیچے میں آیا۔ اور چہار دیواری سے باہر کودا گویا کوئی اُسکے تعاقب میں ہے۔

صبح کا ذب کا وقت ہو گیا تھا۔ پرتاپ کے ایمان کی طرح آسمان میں تارے جھللا رہے تھے۔ اور چمکی کی گھر گھر آواز کانوں میں آتی تھی۔ پرتاپ پر دباتا۔ آدمیوں کی نظریں بچاؤ لگانے کی طرف چلا۔ بچاؤ ایک اُسے سر پر ہاتھ رکھا تو ٹوٹی کا پتہ نہ تھا۔ اور نہ جیب میں گھڑی دکھائی دی۔ اُسکا کلیجہ سن سے ہو گیا۔ اور دل سے بے اختیار ایک آہ نکل آئی۔

بعض اوقات ہماری زندگی میں ایسے واقعات ہو جاتے ہیں۔ جو دم زدوں میں اُسکی صورت پلٹ دیتے ہیں۔ کبھی والدین کی ایک چچی نگاہ بیٹے کو نیکنامی کے ساتویں آسمان پر پہنچا دیتی ہے۔ اور کبھی بیوی کی ایک نصیحت شوہر کو مہاتارشی بنا دیتی ہے۔ غیر مند ہستیاں اپنے یگانوں کی نگاہوں میں ذلیل ہو کر دنیا کا بوجھ بٹنا نہیں برداشت کر سکتیں۔ انسانی زندگی میں ایسے موقعے خدا داد ہوتے ہیں۔ پرتاپ چندر کی زندگی میں بھی وہ مبارک وقت تھا جب وہ چچا پر گلیوں میں ہوتا ہوا انگٹا کے کنارے آکر بیٹھا۔ اور افسوس و ندامت کے آنسو بہانے لگا۔ افس کی حوصلہ انگیز یوں نے اُسے ذلیل و خوار کرنے میں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔ مگر اُسکے لئے یہ تازیانہ اُستاد مہربان کا تازیانہ ثابت ہوا۔ کیا بہتر تجربہ نہیں کر رہی بعض اوقات آب حیات کا کام دیتا ہے۔

جب صبح ہوا کا جھونکا سلگتی ہوئی آگ کو دھکا دیتا ہے اسی طرح اکثر دلوں میں وہ بے ہوش جوش کو متحرک کرنے کے لئے کسی ظاہری تحریک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنی مصیبت کا تجربہ۔ اور دوسرے کی مصیبت کا نظارہ ایسا اوقات دل میں وہ دیر آگ پیدا کر دیتا ہے جو محبت مطالعہ اور خلقی مناسبت کے اثر سے بھی ممکن نہ تھا۔ اگرچہ پرتاپ چندر کے دل میں نیک اور فیاض زندگی ہرگز نیک خیال پہلے ہی سے تھا۔ مگر نفس کے اس تازیانہ نے وہ منتر لکھیں طے کر دی جبکہ طے ہوئے ہیں برسوں گئے۔ اُسکی زندگی کا ارادہ متقل ہو گیا معمولی صورتوں میں قومی خدمت اُسکی زندگی کا ایک لچسپ اور غالباً فردی

مشغلہ ہوتی۔ مگر ان واقعات نے قومی خدمت کو اسکی زندگی کی غرض اور غایت بنا دیا۔
سبب مافی دلی آرزو پورے ہونے کے سامان پیدا ہو گئے۔ کیا ان واقعات کی تہ میں کوئی
غیبی طاقت متحرک تھی۔ کون کہہ سکتا ہے۔

بانیسویں فصل

— — —

ہر دو ار سے بہت دور شمال کی طرف۔ پچھار پہاڑوں میں۔ ایک چشمہ کے کنارے
ایک نوجوان بیٹھا ہوا نظر آتا تھا۔ جگر بہت خوفناک تھی۔ درندے دن دھاڑے چل قریب
کرتے تھے۔ مگر یہ شخص شب در در ایک ہی چٹان پر بیٹھا رہتا۔ وہ جگر کا بہت مضبوط تھا۔
اُسکے چہرے سے وحشت برستی تھی۔ کپڑے بھٹ کر تار ہو گئے تھے۔ بال بڑھ آئے
تھے۔ مگر ظاہر ان باتوں کی اُسے مطلق پروا نہ تھی۔ اُسکے پاس نہ اوڑھنا تھا نہ لیٹر۔
نہ برتن نہ بھانڈے۔ کبھی کبھی جنگلی پھل کھا لیا کرتا تھا۔ ایسا بے سرو سامان آدمی کسے
دیکھا ہوگا۔ یہ پرتاپ چندر تھا۔

پرتاپ چندر کو یوں بسر کرتے کئی مہینے گزر گئے ہیں۔ وہ اپنے نفس سے لڑ رہا ہے۔
مگر فتح نہیں ہوتی۔ اُسنے دشمن کو جیسا حقیر سمجھا تھا اُس سے ہر جہا طاقتور پایا۔ جسوقت تک
وہ الہ آباد میں تھا ذاتی عیش اور تنعم کے خیالات اُسکے دل میں نام کو بھی نہ آتے تھے۔ مگر
اس دیرانے میں اُسکا خیال بار بار اُنھیں باتوں کی طرف مچھکتا۔ وہ خیالات کے مجتمع کرنے
میں کامیاب نہ ہوتا۔ اکثر ایک نازنین کی تصویر اُسکی نگاہوں کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی جو

برجن سے بہت مشابہ تھی۔ تحیل ایک عالی شان مکان بنواتا۔ اُسے شینہ آلات و لوازم سے سجاتا۔ جاں بخش نعروں کی میٹھی الاپ کانوں میں آنے لگتی۔ عاشقانہ جھیر جھار اور شہنائی شیریں اولادوں کے دور چلنے لگتے۔ گھنٹوں اسی پُرم سرور خواب کے مزے لوٹتا۔ پھر کایک وہ چونک پڑتا کہ میں کیا بیہودہ باتیں سوچ رہا ہوں۔ اور خیالات کو ادھر سے ہٹا کر مسئلہ پیش نظر پر جاتا۔ مگر بھرنوں کی شیریں نوائیاں۔ اور غزالوں کی کلیلیں خیالات کے قدم میں زنجیر گرا نبار کا کام کرتی۔ یہاں تک کہ وہ مایوس ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ اور دل میں کہتا کہ میری زندگی یوں ہی خواب دیکھنے میں گزریگی۔

رفتہ رفتہ اُسکی یہ حالت ہو گئی کہ کھانے پینے کی مطلق سدہ نہ رہتی۔ سویرے سے

شام تک دیوانہ وار بیٹھا ہوا درختوں کی شاخوں اور پتھروں کی چٹانوں سے نظریں ملا کر تارخیال کی طاقت بڑی زبردست ہے۔ قومی خدمت کے خیال میں غرق رہتے رہتے اُسکے دل میں درد کا سچا جذبہ پیدا ہوا جسکے بغیر بغیر من خدمت محال ہے۔ کسی بوڑھے ضعیف آدمی کو لکڑیاں توڑتے دیکھتا تو خود اُسکی لکڑیاں توڑ کر اُسکے گھر تک پہنچا آتا۔ بھولے بھٹکے مسافر کو گمراہی سے لیکر لایا تک جاتا۔ ان کاموں میں اُسے روحانی مسرت حاصل ہوتی یہاں تک کہ کس پاس کی آبادیوں میں ان نیک کاموں کا شہرہ ہو گیا۔ لوگ سمجھنے لگے کہ کوئی مہاتما رہی ہیں۔ عورتیں آتیں کہ مجھے سال بھر سے لڑکا نہیں ہوا۔ کوئی دعا تو دینے دیجئے۔ مرد اُسے کہ میرے روزگار کی فکر کر دیجئے۔ آخر پر تاپ چند دریاں سے گھر کر بھاگا۔ اور دشوار گزار گھاٹیوں کو تیرتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ یہاں ایک اونچی چوٹی پر چھوٹی سی منڈھیا تھی۔ اُسکے قریب ایک چٹان پر اُسے بھی اپنا آسنا جایا۔

یہاں رہتے اُسے چھ مہینے گزر گئے۔ اور اب اُسے اپنے دل میں ایک باطنی طاقت

محسوس ہونے لگی۔ جذب خیال کی قوت پیدا ہو گئی۔ گراؤ اسکی آتما ابھی تک کمزور تھی۔ اسکا ثبوت بھی اُسے جلد مل گیا۔ ایک روز شام کی وقت وہ بیٹھا ہوا تھا کہ یکایک شیر کی ہولناک گرج اسکے کانوں میں آئی۔ آواز سنتے ہی اُسکے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور دل دھڑکنے لگا۔ گروہ سنبھل بیٹھا۔ اور اُدھر اُدھر چوکنی نگاہوں سے تاکنے لگا کہ آواز کدھر سے آئی۔

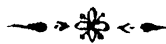
کیا دیکھتا ہے کہ ایک خوشخوار شیر چشمہ کے کنارے ایک بے بس ہرن پر لوٹ پڑا ہے۔ اور اپنے آہنی جبرے اُسکے گروں میں چھب رہا ہے۔ اُسکی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ یہ مہینہ ناک نظارہ دیکھتے ہی پر تپ چندر کا میاؤ جھوٹ گیا۔ وہ بے اختیاری طور پر اُٹھا کہ مندر میں جا چھپوں۔ مگر اسی اثنا میں ایک لاغر اندام شخص حبلی ریش دراز نات تک آئی ہوئی تھی۔ اور چہرہ بدر کمال کی طرح منور تھا۔ ہاتھ میں ایک گنڈا اسالے ہوئے سٹکلا اور دلیرانہ وار قدم بڑھاتا ہوا شیر کے سر پر جا پہنچا۔ شیر جھلایا تو تھا ہی۔ شعلہ بار آنکھوں سے گھورتا ہوا دوڑا۔ مگر زدیک آتے ہی اُسکی آنکھیں جھپک گئیں۔ اور ایک غطا دار شخص کی طرح جواپنے آقا سے معافی کا طالب ہو زمین پر لیٹ گیا۔ سادھو نے آہو نیچان کو اُٹھائی میں اُٹھالیا۔ اور مندر میں لا کر مرگ چھالے پر لٹا دیا۔ چند بوٹیاں پتھر پر گھسکر اُسکے زخموں پر لگائیں۔ اور تب اپنی کفنی کو جسپر تازہ گلہاے خون زیب دے رہے تھے دھونے کے لئے چشمہ کی طرف چلے۔ جیسے کوئی شیعو کا پوجاری کسل کے پھولوں کو جل دان کے لئے لیجاتا ہو۔ پتا اُس حیرت انگیز روحانی کرشمہ سے اتنا موثر ہوا کہ کچھ دیکھ کر نقش دیوار کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا پھر سوچنے لگا افسوس کیا میری آتما اتنی کمزور ہے۔ کیا مجھے اپنی جان اتنی پیاری ہے!

پر تپ چندر اپنی اس بُزدلی پر ایسا جھنجھلایا کہ آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ خون جوش کھانے لگا۔ ایک مضبوط لکڑی کا کندہ اُٹھا کر۔ کسی بدست شربابی کی طرح لڑکھاتی ٹانگوں سے

وڑتا ہوا شیر کے کٹے پر جا پہنچا۔ شیر نے اُسے دیکھا اور دیکھتے ہی اُسکے تیر بدل گئے۔ بادل کی طرح گر جا۔ اور قریب تھا کہ جست مار کر پرتاپ کی گر دن دلوچے کر اتے نہیں اُسے لکڑی کا کندہ اپنی پوری طاقت سے اُسکے سر پر چنگ دیا۔ مگر شیر کے فولادی سر پر اسکا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ وہ اور بھی جمایا۔ اور اس زور سے گر جا کے جھل کے تمام جالوز اپنے اپنے کمین گاہوں نخل پڑے۔ اور دونوں اگلے پنجے اُسکی کمر میں ڈال دیئے۔ وقتاً اُسکے سر پر گنڈا سے کا بھر پڑا ہاتھ پڑا طیش کھا کر پیچھے کی طرف دیکھا تو سادھو بابا کھڑے ہیں۔ اُسے فوراً پرتاپ کو چھوڑ دیا اور در سے کراہتا بھاگا۔

پرتاپ چند رنے ان بابا جی کو اکثر مندر سے آتے جاتے دیکھا تھا۔ مگر اسوقت جو نزدیک سے اُنکے پر جلال چہرہ پر نگاہ ڈالی تو صورت کچھ مانوس معلوم ہوئی۔ سوچنے لگا کہ میں نے انھیں کہاں دیکھا ہے۔ مگر حافظہ نے یاری نہ دی۔ نہ امت سے سر جھکا کر بولائیے آپکو کہیں اور دیکھا ہے۔“

سادھو جی نے مسکرا کر فرمایا ”یہ کیوں نہیں کہتے کہ برسوں آپکی گود میں کھیلا ہوں؟“ اتنا سنتے ہی پرتاپ کے آنکھوں سے پردہ سا ہٹ گیا۔ کلیبہ نے جست ماری اور لبوں تک اک پہنچا۔ ایک پرجوش فرزند از بخودی کے ساتھ اُنکے سینے سے لپٹ گیا۔ اور آنکھوں سے آنسو کے قطرے گرنے لگے۔ منشی سچون لال نے پیراز شفقت سے اُسکے سر پر ہاتھ بھرا۔ اور آنسو پونچھے۔



تیسویں فصل

تیاری

جیسے کوئی منجد ہمارے میں پڑھی کشتی طوفان کے تھپیڑوں اور تلاطم کے جھکولوں سے اپنی جان بچا کر کسی بندرگاہ کے آغوش میں جا پہنچتی ہے اسی طرح پرتاپ چند رات ایک ایسے مسکن میں آگیا تھا جہاں اُسکے دماغ کو اطمینان تھا اور دل کو قرار۔ وہ اب اُس پہنچے ہوئے مسافر کی طرح نہ تھا جو اندھیری رات میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہو سب اُسے اپنا راستہ۔ اُسکے نشیب و فراز اور منزل مقصود صاف نظر آتے تھے۔ منفی سنجیوں لال کی صحبت اور تلقین نے چند ہی مہینوں میں اُسکے دل سے وہ کمزوریاں محو کر دیں جنہیں وہ سخت کمزور تھا۔ کے بعد بھی دور کرنے میں پورے طور پر کامیاب نہوا تھا۔ ایک عارف کامل کی چند روزہ صحبت تزکیہ نفس کے لئے برسوں کی اندرونی کشمکش اور مطالعہ سے بدرجہا زیادہ مفید ہوتی ہے۔

مٹی جی اُسے ہر روز جھگوت گیتا پڑھاتے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی بحرِ عمیق کی عوامی میں صرف کیا تھا۔ ادا دھرتی ہر سال تک کتنے ہی لوگوں اور سلیا سلیوں کے حرمِ دانش سے خوشہ چینی کی تھی۔ وہ ایک ایک نکتہ کی ایسی تشریح کرتے۔ اُنکا لہجہ ایسا دلکش اور طرزِ بیان ایسا سرور انگیز تھا کہ پرتاپ پرخود فراموشی کا عالم طاری ہو جاتا۔ اُنکے ایک ایک لفظ میں وہ اثر ہوتا تھا جو کسی خانقاہ روحانیت کے بے واسے ہی کی باتوں میں ہو سکتا ہے۔ پرتاپ چند رات کے خیالات روز بروز زیادہ

پاک۔ زیادہ بغرض۔ اور حوصلے زیادہ وسیع اور زیادہ بلند ہوتے جاتے تھے۔ اُس نے یوگ کی مشق بھی شروع کر دی تھی جول جول اس میدان میں وہ قدم اُگے بڑھاتا تھا اُسکی ہمدردیاں زیادہ وسیع اور عام ہوتی جاتی تھیں۔

اس طرح دو سال گذر گئے۔ پرتاپ چندر کے قوارسہانی شیر و مکی طرح مضبوط اور تومند ہو گئے۔ ادبچی سے ادبچی پہاڑیوں پر بے تکان چڑھ جاتا۔ منتر و مکی مسافت طے کر کے یوں اُٹھتا گویا کسی باغ کی سیر کر کے لوٹا ہے۔ قوت برداشت اتنی مضبوط ہو گئی تھی کہ بردشتانی چوٹیوں پر سنگین چٹانوں کا بستر بنا کر ایسے آرام سے لیٹا گویا آراستہ مکان میں مچلی گدہ دل پر لیٹا ہوا ہے۔ اُسکا چہرہ الیا روشن ہو گیا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں جھپک جاتی تھیں۔ اُسپر شانوں تک بکھرے ہوئے بال اور دروسے بھری ہوئی آنکھیں اُسے رحم کی مورت بنا دیتی تھیں۔ روشن رخساروں پر سبزہ نود میدہ ایسے معلوم ہوتے تھے گویا پروانے شمع پر تار ہو رہے ہیں۔ کیسا حُسن مردانہ تھا۔ کہ پہلی ہی نظر میں اُسکی تصویر پردہ دل پر ہمیشہ کے لئے کھینچ جاتی تھی۔ یقیناً جب وہ اپنا آسَن بچھا کر یوگ سادھن کرتا ہو گا تو کیلاس کی بنے والی اپسرا ایسے اُسپر تار ہوتی ہوگی۔

جس وقت وہ جڑی بوٹیوں کا لہجہ لیکر قدم بڑھاتا ہوا چلتا تو پہاڑوں کے بنے والے مرد اور عورتیں اضطرابی طور پر اُسکے روبرو سر جھکاتے۔ اور بیوقوفانہ جھاپیاں اور چٹائیاں اُسے اپنے دامنوں میں چھپا دیتیں اُسکی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھا کرتے۔ اُسکے علان میں وہ تاثیر تھی۔ باتوں میں وہ مٹھاس اور آنکھوں میں وہ جاودہ گردنوں کے لوگ سمجھتے وہ دیولوک کا کوئی رشی ہے۔

ایک روز سیمون لال نے پرتاپ چند سے کہا بالانند جی! چلو تمہیں اب دوسرے

مقامات کی سیر کراؤں۔ اس پاک سرزمین میں کتنے ہی سنیاسی اور رشی دنیا سے منہ مڑ کر
 بھگوت یجن کر رہے ہیں۔ میں نے ایک بار سب کے درشن کر لئے ہیں۔ مگر اب پھر اُنکے درشنوں
 کے لئے جی بے چین ہو رہا ہے۔

پرتاپؔ میں بہ سروچشم حاضر ہوں۔ یہاں سے کسطن کا قصد ہے؟
 سنجیون لالؔ پہلے سنت دھام کو چلیں گے۔ وہاں کئی مہاتماؤں کے درشن ہونگے
 وہاں سے پورب کی طرف کیلاش ہے۔ کیلاش سے سیدھے گیان سرور کی طرف
 سدھاریں گے۔ ایسا دلکش مقام پرودہ زمین پر اور کہیں نہ ہوگا۔ عین ساگر کے کنارے
 شری برہما تندی کا دھام ہے۔ اُن کے قد مونہر سر جھکائیں گے مجھے کتنے ہی
 رشیوں سے فیض صحبت کا موقع ملا ہے۔ مگر برہما تندی تاروں میں جاند ہیں۔
 نکھیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہونگے۔

پرتاپ چند رسے روانگی کی تیاری کرنی شروع کی اور تیاری ہی کیسے تھی۔ دو مگر کچھ
 بڑی بوٹیوں کا لقمہ۔ اور چند کتابیں اس مسکن کی ساری کائنات تھی۔ انہیں اُس نے
 افضل میں جایا۔ اور دونوں آدمی چل کھڑے ہوئے۔ مگر ابھی پہاڑی سے اترے بھی
 نہ تھے کہ جنگلی جانوروں کے غول کے غول پیچھے چلائے اُچھلتے کودتے نظر آئے۔ ہرن۔
 بکریاں۔ ریچھ۔ شیر۔ پستے۔ سب کے سب پہلو پہلو بھاگے چلے آتے تھے۔ گویا ہر ایک
 اپنے دھن میں ایسا مست تھا کہ اُسے دوسروں کی خبر نہ تھی۔ اُن کی آن میں اُن جانوروں
 نے دونوں بھاگڑوں کے گرد حلقہ باندھ لیا۔ کوئی اُنکے ہاتھ چاٹنے لگا۔ کوئی پیروں پر
 سر گرڈنے لگا۔ کوئی دردناک آواز میں چیخ رہا تھا۔ کوئی اکرہوں بیٹھا ہوا زمین کی طرف
 تاک رہا تھا۔ گویا اپنے محسن کی بھائی کا صدمہ اظہار کی قابلیت سے بہت زیادہ دلدادہ

تھا۔ بے زبانوں کے دل میں بھی وہی جذبہ محبت اور مہمی صدمہ فراق ہوتا ہے۔ جو حضرت انسان کی زندگیاں تلخ کر دیا کرتا ہے۔ اگرچہ اُسکا اظہار مرثیہ اُنھیں لوگوں کے روبرو ہوتا ہے جبکی اندرونی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ اور جبکی آتمائیں اسقدر وسیع ہیں۔ کہ جنم ساہر کی زیرنگیاں اُنکا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ اس کو ہستان کے ایک ایک ذی روح سے ان دونوں آدمیوں کو پہچانی ہمدردی تھی۔ اُنکا مسکن ان بے زبانوں کے خوش فلیوں کا اکھاڑہ تھا۔ اور اُنکے ننھے ننھے خوبصورت بچوں کے سونے کا گوارہ۔ اور کلیں کر نیکا سیدان اس پُر سحر حلقہ میں اگر اُنکی باہمی بخشش اور کدورتیں ست جایا کرتی تھیں۔

شام ہو گئی تھی۔ اور دونوں آدمی مردانہ وار قدم بڑھاتے چلے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کو ہستان کے ایک ایک گوشہ کا نقشہ اُنکی نگاہ میں کھنچا ہوا ہے۔ نہ اُنکے قدم پھسلتے تھے۔ نہ ڈو لگاتے تھے۔ تیرہ وتار وادیاں جہاں شاید کسی ذی روح نے قدم نہ رکھا ہو۔ اور عمودی چوٹیاں جسکی بلندی کو پرندے بھی نگاہ حسرت سے دیکھیں۔ اُنکے لئے ایسے آسان اور سہل گذار راستے تھے جیسے کوئی صاف ستھری سڑک۔ یا کسی باغ کی روشنی۔ اُنکے دل مردوں کے دل تھے۔ اور اعضا شیروں کے۔ پرتاپ کا تو غیر غفلان شباب تھا۔ مگر فشی جی بھی باوجود پیرانہ سالی کے ایک چٹان سے دوسری چٹان پر بے دھڑک کود جاتے۔ اور پُر شور کو ہستانی نالوں میں بے محابا گھس پڑتے۔ گویا ان موافقا ظاہر کی اُنکی نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں تھی۔

اس طرح باد یہ بچائی میں کہی سینے لگے۔ دن بھر راستہ چلتے۔ اور رات کے وقت کسی مہاتما غشی کے استھان پر ٹھہر جاتے۔ اور اُسکے ست سنگ سے فیضیاب ہوتے۔ پرتاپ چندر کو اکثر یہ خیال گذرتا کہ اگر یہ فقرار قدسی صفات قوم کی خدمت کی طرف متوجہ

برسم جنبہ کہ ہم دنیا کے ۱۶۱ سے بڑے افسانہ نگاروں

صفت سے کھرا کر سکتے ہیں۔ جو روبرو کا نشان مٹا دیتے۔ کیسے روشن دل لگتے تھے! کیسے متنی!

دولت و شہرت۔ ثروت و جاہ۔ نام و نمود اور دوسری دنیاوی نعمتیں جو حضرت انسان کی زندگی کا معراج خیال کی جاتی ہیں انکی نگاہوں میں محض سنگریزے تھے جو حقیقت کے

موتی۔ اور معرفت کے ہیروں کے ہانگ بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ آخر منزل طے ہوئی۔ اور گینا

سرور کے نواح میں آپہنچے آہ! کیسا سہانا منظر تھا۔ اُسے دلکش کہنا اُسکی ذمت کرتا

ہے۔ اگر دنیا میں کوئی جگہ ایسی ہے جسے اُسکی آنکھ کہہ سکیں تو وہ کوہ ہمالہ ہے۔ اور یہ جگہ

اُس آنکھ کی پتلی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جسے پرائوں میں دیولوک کا مقدس نام دیا گیا ہے

یہاں گندھرب اور اسپرائین بستی ہیں۔ اور اُنکے مہشقی نعموں کی دلاویز صدا شوق کے

کانوں میں آتی ہے۔ پر تاپ پر اس منظر نے خود مستی کی کیفیت طاری کر دی۔ نگاہیں جبر

جابتیں ادھر سے ہٹنے کا نام نہ لیتیں۔ روح اور قلب پر ایک تقدس آمیز عجب پھار ہوا تھا۔

کوئی کیسا ہی بے اعتقاد شخص کیوں نہ ہو۔ مگر اس پاک سرزمین میں داخل ہوتے ہی اُسکی

روح پر وہ سرور ہوگا جو اُسے مدت العریاد رہیگا۔ یہاں کی ہوا میں سانس لینا۔ اور یہاں

کے زمین پر قدم رکھنا جام روحانیت سے شاد کام ہوتا ہے۔ دونوں طرف۔ جہاں تک نگاہ

جاتی ہے۔ سر بہ فلک پہاڑیوں کا سلسلہ چلا جاتا ہے۔ ایک کے اوپر ایک۔ ایک واپزیر

بیقاعدگی کے ساتھ لدی ہوئی ہیں۔ گویا آسمان پر منڈلانے والے بادل یہاں سیر کرنے

کے لئے اُتر آئے ہیں۔ انکی چوٹیوں پر جابجا برن کے تودے پڑے ہوئے ہیں۔ جنہیں

آفتاب کی آخری شعاعوں نے زرنگار بنا دیا ہے۔ جیسے اتنی بلندی پر روحان بستی کے

لئے سہرے تخت سجائے گئے ہوں۔ انہیں پہاڑیوں کے بیچ میں گیان سرور آہستہ

آہستہ موجیں مار رہا ہے۔ گیان کی طرح آفتاب اور آہار۔ اُسین حصں اور بطاور بگلے

خوش فحلیاں کر رہے ہیں۔ گویا آسمان پر تارے نکلے ہوئے ہیں۔

یہ ایک منشی سیمون لال نے کہا۔ بالاجی دیکھو جھیل کے کنارے وہ چھوٹی سی کٹی جو نظر آرہی ہے وہی برہمانند جی کا ستھان ہے۔ ”یہ سنتے ہی اشتیاق نے پرتاپ چند کے قدم اور بھی تیز کر دیے۔ ذرا دیر میں دونوں آدمی کٹی کے دروازے پر پہنچ گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سوامی برہمانند جی جھیل کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھے ہوئے سندھیا کرنے میں مصروف ہیں۔ اسکا چہرہ ایسا پر جلال ہے گویا آفتاب ابھی ابھی گیاں سرور کے اغوش سے نکل آیا ہے۔

چوبیسویں فصل

برجن شاعر ہو گئی

جب سے منشی سیمون لال تیرھ جاترا کو نکلے۔ اور پرتاپ چند رالہ آباد چلا گیا اسوقت سے صاحبام کی زندگی کی روش بالکل تبدیل ہو گئی تھی۔ اُس نے ٹھیکہ کے کاروبار کو ترقی دینا شروع کیا۔ اور اُسے نہایت وسیع پیمانے پر پہنچا دیا۔ ستری جی بدستور دیانت اور موثیلدی سے اپنا کام کرتے تھے۔ منشی سیمون لال کے زمانے میں بھی کاروبار کو اتنا فروغ نہ حاصل ہوا تھا۔ سبب امارات کی رات بیٹھے اینٹ پتھر سے سر مارا کرتی۔ اور ستری جی نے کے فکر میں پڑنا رہتی۔ پانی پانی کا حساب جانچتی۔ اور کبھی کبھی خود مزدوروں کے کام کی دیکھ بھال کرتی۔ ان کاموں میں اُسے ایسا اناک ہوا کہ وہ ان اور برت سے جو اُسکے پرانے شغل تھے کسی قدر لاپرواہی

ظاہر ہونے لگی۔ باوجود وزافزوں آمدنی کے سببامانے خرچ کی کوئی مد زیادہ نہ ہونے دی۔ کوٹڑی کوٹڑی دانتوں سے پکڑتی اور سید سب اس لئے کہ پرتاپ چند صاحب مال ہو جا سکے اور اپنی زندگی بھر فارغ البال و خوشحال رہے۔

سببا کو اپنے ہونہار بیٹے پر ناز تھا۔ اسکی زندگی کی رفتار دیکھ دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ جو آرزو دل میں رکھ کر مینے اولاد مانگی تھی وہ آرزو ضرور پوری ہوگی۔ وہ کالج کے پرنسپل اور پروفیسروں سے پرتاپ کا حال خفیہ طور پر دریافت کیا کرتی۔ اور انکی رپورٹوں کا مطالعہ اُسکے لئے ایک دلچسپ فسانہ تھا۔ ایسی صورت میں الہ آباد سے پرتاپ چند کے لاپتہ ہو جانے کا تار پہونچنا گویا دل و دماغ پر کبلی کا گرنا تھا۔ سببامانے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور سر ہٹا کر بیٹھ گئی۔ تیسرے دن پرتاپ چند کی کتابیں پکڑ کر دوسرے اسباب بھی پہونچے۔ یہ زخم پر اور چرکا تھا۔

ایک دن وہ پرتاپ چند کی کتابیں اُلٹ پلٹ رہی تھی کہ اُسے ایک ریشمی رومال میں بہت سے خطوط حفاظت سے لپٹے ہوئے دکھائی دیئے۔ یہ برجین کے خطوط تھے سببامانے انھیں پڑھنے لگی۔ اور ایک ایک کر کے سارا دفتر ختم کر ڈالا۔ آج وہ بہت رونی۔ دوسرے دن جب برجین نے خبر سنی تو وہ گہرائی ہوئی سببامانے کے یہاں آئی۔ سببامانے چٹھیوں کا پلندہ اُسکے سامنے پھینک دیا۔ اور منہ پھیر لیا۔ برجین کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور پر غرور لہجہ میں بولی پٹچی۔ اس بدگمانی پر آپ بہت ہچکچاتیں گی۔ یہ لہکدوہ اُلٹے قدم اپنے گھر لوٹ آئی۔

پریمیوتی کے مرنے کی خبر پاتے ہی پران ناٹھ پٹنہ سے اور رادھا چرن منی تال سے روانہ ہوئے۔ اُسکے جیتے جی آتے تو ملاقات ہوتی۔ مرنے پر آئے تو مٹی دیکھنی بھی نہ نصیب ہوئی۔

مڑتک سفکار سب بڑی دھوم سے ادا کئے گئے۔ دو ہفتہ گانوں میں خوب چل پل رہی۔ اسکے بعد رادھا چرن مراد آباد چلے گئے۔ اور پران ناتھ نے پٹنہ چلنے کی تیاری شروع کی۔ انکا ارادہ تھا کہ بیوی کو الہ آباد پہنچاتے ہوئے پٹنہ جائیں۔ مگر سیوتی نے ضد کیا کہ جب یہاں تک آئے ہیں تو برج کے پاس بھی ضرور چلنا چاہئے۔ ورنہ اُسے صدر ہوگا سمجھیں کہ مجھے کیس سمجھکر ان لوگوں نے بھی تیاگ دیا۔ لہو نے بہت حیلہ و حجت کی کہ مجھے جواب طلب ہوگا۔ مسئلہ ہو جاؤ لنگا۔ کیا عجب ہے کہ تنزلی کی بھی توبت آجائے۔ آخر سیوتی نے انکا ہاتھ پکڑ کر انکی طرف اس اتو کھی نگاہ سے دیکھا جس میں مایوسی بھی تھی۔ اور محبت بھی۔ ضد بھی تھی۔ اور رضا بھی۔ لہو اس نگاہ سحر کار کی تاب نہ لا سکے۔ رضائے وہ کام کر دکھایا جو ضد سے مشکل تھا۔ بیوی کے گل عارض کا بوسہ لیکر پوئے۔ ”رودیں کیوں؟“

سیوتی: ”تم رلانے لگے ہی ہو۔“
 پران: ”اچھا تمہارا ہی کہنا کرینگے۔ لو اب خوش ہو جاؤ۔“

لہو مدھوش ہو گیا۔ اُس نگاہ میں نمونکا نشہ تھا۔ اسی نگاہ نے گہر تباہ کر دیئے ہیں گلوں پر خور چلا دیئے ہیں۔ سلطنتیں مٹا دی ہیں۔ لہو نے تو کوئی غیر معمولی کام نہیں کیا۔ مرن ایک معزز عہد سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ایک ننھی سی آنکھ میں کتنی طاقت ہے!

سیوتی کا اس خانہ ویران میں آنا گویا پھولوں میں مکہ کا آنا تھا۔ ہفتہ بھر کے لئے اچھے دلوں کی بوباس آگئی۔ برج بہت خوش ہوئی۔ اور خوب روئی۔ مادھوی نے منو کو گود میں لیکر خوب سا پیا کیا۔ مردانے کمرے میںوں سے بندھے تھے۔ آج انکی قمتیں بھی کھلیں۔ اڑا ہوا آسمان بہا۔

پریوتی کے چلے جانے کے بعد برج اس گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ مرن مادھوی اسکی

انیس وغوار تھی۔ اس تنہائی۔ سوز جگر اور درد دل نے اُس کا وہ ذاتی جوہر لھو کو شمع کی طرح
 چھپا ہوا تھا۔ اور جس نے اُس کے نام کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ وہ شعر و سخن میں طبع آزمائی کرے تا
 لگی حشاعی سچے جذبات کی تصویر ہے۔ اور سچے جذبات خواہ وہ دور کے ہوں۔ یا مُسرت کے۔
 اسی وقت دل میں پیدا ہوتے ہیں جب ہم درد یا مُسرت کا مزہ چکھتے ہیں۔ اور جذبات کے پیدا
 ہونے کے بعد اُن کا زبانِ قلم تک آنا تو ایک آسان بات ہے۔ برجن ان دنوں رات کی رات
 میٹھے بھاشا میں اپنے خیال کے موتی پرویا کرتی۔ اُس کا ایک لفظ سوز اور ویراں کا ایک ایک
 دفتر ہوتا تھا۔ دوسرے شاعروں کے دل میں دوستوں کی واہ واہ۔ اور سخن بنوں کے بھان
 سے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ مگر برجن اپنی داستانِ غم اپنے ہی دل کو سناتی تھی۔ اُس کے
 بلند خیالوں کی داد دینے والی شمع خاموش تھی۔ اور سمند فکر کو تازہ یاز لگانے والی سبکی۔

سیوتی کو آئے دو تین دن گزرے تھے۔ ایک دن اُس نے برجن سے کہا میں تمہیں اکثر کسی
 گہرے خیال میں ڈوبا ہوا پاتی ہوں۔ اور کچھ لکھتے بھی دیکھتی ہوں۔ مجھے نہ بتاؤ گی؟ برجن
 شرمیلی۔ بہانہ کرنے لگی کہ کچھ نہیں۔ یوں ہی جی کچھ کھویا سا رہتا ہے۔ سیوتی نے کہا میں نہ مانو گی
 یہ کہ وہ برجن کا صند و قچہ اُٹھالائی۔ جس میں شاعری کے ابدار موتی رکھے ہوئے تھے مجبور
 ہو کر برجن نے اُسے اپنی تازہ نظم سنائی شروع کی۔ مُنہ سے پہلے مصرع کا کھٹنا تھا کہ سیوتی
 کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور جب تک ساری نظم نہ ختم ہوئی وہ نقش حیرت بنی بیٹھی رہی۔
 پر ان ناخفہ کی محبت نے اُسیں سخنِ فہمی کا مادہ پیدا کر دیا تھا۔ ہر تازہ مصرع سے اُس کے گوشہ
 میں ایک کسک سی ہوتی تھی۔ اور اُنکھیں بھر بھر آتی تھیں۔ جب برجن خاموش ہوئی تو ایک
 سمان بندھا ہوا تھا۔ جیسے کوئی دلکش نمند بند ہو گیا ہو۔ سیوتی نے برجن کو گلے لگا لیا۔ اور دوڑی
 ہوئی لڑکے پاس گئی۔ جیسے کوئی بچہ ناکھلوتا پا کر خوشی سے دوڑتا ہوا اپنے بھولیوں کو دکھانے

جائے۔ پران نامتھ اپنے آقا سے نامدار کو عرضی لکھ رہے تھے کہ میری والدہ سخت بیمار ہو گئیں۔ اسوجہ سے حاضر خدمت ہونے میں دیر ہوئی۔ اُمید وار ہوں کہ ایک ہفتہ کی اتفاقیہ مُصمت عطا فرمائی جاوے۔ سیوتی کو دیکھ کر چٹ اپنی درخواست چھپا دی۔ اور مسکراے۔ انسان کیسا مکار ہے۔ اپنے آپ کو بھی دھوکا دینے سے نہیں بچتا۔

سیوتی ”ذرا نذر چلو۔ تمہیں برجن کی کتنا سناؤں۔ پھر ٹک اٹھو گے۔“

پران ”اچھا اب اُنہیں کتنا کاشوق ہوا ہے۔ انکی بھانج بھی تو گایا کرتی تھیں سُن تو شام بڑے بے کھبر ہو۔“

سیوتی ”ذرا چکر سُنو تو۔ پیچھے چھٹنا۔ مجھے تو اسکی شاعری پرا چنبھا ہو رہا ہے۔“

پران ”چلو ایک خط لکھ آتا ہوں ابھی۔“

سیوتی ”اب یہی مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں آکے کا غد فوج ڈالو گی۔“

سیوتی پران نامتھ کو کٹاں کٹاں لے آئی۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ برجن نے

کوئی معمولی بھجن بنایا ہو گا۔ اسیکو سنانے کے لئے بیقرار ہو رہی ہو گی۔ مگر جب اندر آکر بیٹھے اور

برجن نے شرماتے ہوئے اپنی پُر زور نظم پریم کی متوالی ”پڑھنی شروع کی تو حضرت کی آنکھیں کھل گئیں۔

نظم کیا تھی۔ درد دل کا ایک دریا اور رازِ اُلفت کا ایک دفتر تھا۔ لکھتے تھے۔ اور وہیں آکر

بھومتے تھے۔ الفاظ کی ایک ایک شفت پر خیال کی ایک ایک پرواز پر بے اعتبار دل سے داو

نکلتی تھی۔ اُنہوں نے بہت سے شاعروں کے کلام دیکھے تھے مگر یہ بلند پروازی۔ یہ تازگی۔

یہ جذبہ کیں نظر نہ آتا تھا۔ اُسوقت کا سامان بندھا ہوا تھا جب طلوعِ آفتاب کے قبل بادِ نسیم

لہراتی ہوئی چلتی بے کلیاں لٹکتی ہیں۔ بھول سکتے ہیں۔ اور آسمان پر ہلکی مٹری چھا جاتی ہے۔ یکایک

شعر میں گلہا سے تازہ کی شبنم کی تازگی موجود تھی۔ اُسپر برجن کا سُر لاپن۔ اور آواز کی لگی

نشہ پر باد صبا کا کام کر رہی تھی۔ آہ! یہ وہ اشعار تھے جنہر برجن نے دل کو شمع کی طرح جلایا تھا۔ لگو تمہارے نیت سے آئے تھے۔ مگر جب وہ اُسٹھے ہیں تو واقعی ایسا محسوس ہوتا تھا۔ گویا پہلو سے دل بچل گیا۔ ایک روز انہوں نے برجن سے کہا ”تمہارا کلام بچھے تو خوب مقبول ہوگا۔“ برجن نے سر جھکا کر کہا ”مجھے یقین نہیں کہ کوئی اسکی قدر کرے۔“

پران نامتھ۔ ایسا ممکن ہی نہیں۔ اگر دلوں میں کچھ بھی احساس باقی ہے تو تمہارے کلام کی موزون قدر ہوگی۔ اگر ایسے لوگ موجود ہیں جو پھولوں کی مہک سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ جو چڑیلوں کی چمک اور چاندنی رات کے سہانے پن کا لطف اٹھا سکتے ہیں تو وہ تمہاری کبتا کو موزون دل میں جگہ دینگے۔“

برجن کے دل میں وہ گدگد سی پیدا ہوئی جو ہر ایک مصنف کو اپنے فکر سخن کی داوٹنے اور اپنے کلام کے مقبول و مطبوع ہونے کے خیال سے ہوتی ہے۔ تاہم وہ نہیں نہیں کرتی رہی۔ مگر وہ نہیں ہاں کے برابر تھی۔ الہ آباد سے ”اندون“ کلام کا نام کا اچھا رسالہ نکلتا تھا۔ پران نامتھ نے ”پریم کی متوالی“ کو وہاں بھیج دیا۔ ایڈیٹر صاحب ایک نکتہ بنج بزرگ تھے۔ دل کھول کر کلام کی داو دی۔ اور جب یہ متوالی نازنین کلام کے روشنیوں میں رنگین لباس پہن کر نکلی تو لوگوں نے اُسے دلوں میں بیٹھا دیا اور انکھوں میں جگہ دی۔ شاید ہی کسی شاعر کی فکر اولین کو ایسی قبولیت عالم نصیب ہوئی ہو۔ لوگ پڑھتے۔ اور حیرت سے ایک دوسرے کا مُنہ تکتے۔ سخن فہم حلقوں میں مہفتوں تک متوالی نازنین کے چرچے رہے۔ کسی کو یقین ہی نہ آتا کہ یہ ایک گننام شاعر کا کلام ہے۔ فیصلہ یہی تھا کہ اس شاعر کو الہام ہو گیا ہے۔

اب ماہ بہ ماہ کلام کے صفحے برجن کے کلام سے مزین ہونے لگے۔ اور ”بھارت مہلا“ کو سپند عام نے شاعری کے مسند اعزاز پر جا بٹھایا۔ بھارت مہلا کا نام بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ گیا۔ کوئی اخبار

یار سالہ ایسا نہ تھا جو بھارت ہملے کلام سے اپنے تئیں نہ سنوارتا ہو۔ اخبار کھولتے ہی نظر پڑنے لگیں بھارت ہملے کو ڈھونڈھنے لگتیں۔ ہاں اسکی آتش بیابیاں اب کسی کو حیرت میں نہ ڈالتیں۔ اُسے خود شاعری کا معیار اونچا کر دیا تھا۔ قلم و سخن کی رانی کے لئے کمال شاعری خواہ وہ کتنا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو ایک لازمی امر تھا۔ نہ کہ قابل حیرت۔

تین سال تک کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ بھارت ہملے کون ہے۔ آخر پران نامتہ سے نہ ہا گیا۔ برجن سے انھیں سخن نہمانہ عقیدت ہو گئی تھی۔ اور وہ مہینوں سے اُسکے حالات زندگی لکھنے کی فکر میں پریشان تھے۔ سیوتی کے ذریعہ سے رفتہ رفتہ اُسکے سوانح زندگی سب دریافت کر لئے اور بھارت ہملے کے عنوان سے ایک جُزر و مضمون لکھا۔ پران نامتہ نے پہلے کبھی کوئی مضمون نہ لکھا تھا۔ مگر فطرت عقیدت نے اُسکے قلم کو تیز اور فصیح بنا دیا تھا۔ عبارت اول سے آخر تک چُست اور خیالات پاکیزہ تھے۔

اس مضمون کا شائع ہونا تھا کہ برجن کو ہر چار طرف سے قدردانی کے نذرانے ملنے لگے۔ رادھا چرن مراد آباد سے اُسکی ملاقات کو آئے۔ کمالا۔ اُمادی سیٹا۔ چند کنور۔ اور کتنی ہی پرانی سکھیاں جنھوں نے یاد بھلا دی تھی۔ ہر روز برجن کے درمخسوں کو آنے لگیں۔ بڑے بڑے صاحب نظر رؤسا۔ جو خود داری کے نشان میں محکام کے روبرو بھی سر نہ جھکاتے تھے برجن کے دروازہ کی زیارت کو آتے تھے۔ چندرا خود تو نہ اُسکی مگر خط میں لکھا جی چاہتا ہے کہ تمہارے پیر دل پر سر رکھ کر گھنٹوں روؤں برجن کے دروازہ پر ہر دم ایک میلہ سالگا رہتا تھا۔

عزیز الرحمن رحمانہ منیر بہاری موسیٰ

بکپیویں فصل

امتحان

مفتی سنجون لال اور پرتاپ چند راجوں ہی سوامی برہمانند جی کے رو برو پونچے کہ انھوں نے چونک کر دیکھا۔ انکی بڑی بڑی آنکھیں نور حقیقت سے ایسی ہی لہریں بھٹیں جیسے گیان سرور اک صدقا سے۔ دونوں نودارد دل نے انکے قدم آنکھوں سے لگائے۔ سوامی جی نے انھیں اٹھا کر چھاتی سے لگالیا اور مفتی جی سے دیر تک سفر کی کیفیتیں پوچھنے لگے۔ بعد ازاں مسکرا کر پرتاپ کی طرف دیکھا۔ اور فرط شفقت سے اسکے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔
تمہک (تمہیں) گئے؟

پرتاپ چند کچھ جواب نہ دیا۔ اسے اسوقت وہ سرور قلب ہو رہا تھا جسکا مزہ دل لیتا ہے۔ گزبان نہیں کہہ سکتی۔ جسوقت وہ سوامی جی کے سینہ سے لپٹا ہے اسے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پریم کے دریائے جے پابیاں میں غوطہ لگا رہا ہوں۔ اسکا دل اور دماغ خود بخود کسی پرنزور کشش سے کھینچا ہوا چلا رہا تھا۔ جیسے کوئی کشتی لہروں کی رگوں میں لنگر مڑا کر بہہ جاتی ہے۔ وہی کیفیت اسکی ہوسہی تھی۔ کلیہ تھا کہ اٹھا چلا آتا تھا۔ اسے حیرت ہوتی تھی کہ میری یہ حالت کیوں ہوتی جاتی ہے۔ جن دھنش کی کشش کا اسے کچھ تجربہ ہو چکا تھا۔ مگر اسوقت محبت کا جو پرم سرور غلبہ اسکی روح پر ہو رہا تھا وہ خیال اور فکر اور تیز کے انداز سے باہر تھا۔

مگر یہ کیفیت مرث پرتاپ ہی کی نہ تھی۔ مفتی جی حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ سوامی جی

کی پر نور آنکھیں بھی آب گوں ہو گئی ہیں۔ اور انکے روشن چہرہ پر جو سرور اور عافیت کی تصویر تھا ^{حاصل} پریشانی کے آثار نمایاں ہیں۔ یہ کہیوں؟ کیا کشتی نے دریا میں بلبل ڈال دی۔ اور دریا بھی وہ جسکی تھاہ نہیں۔ ایسا تو کہیں ہوتے نہیں دیکھا۔

دوسرے دن سوامی جی نے بالکل دم کو دیدوں کی تلقین کرنی شروع کی۔ ایسے عافیت کا
 انکے رہبر و زانوے ارادت تہہ کرنا وہ موقع تھا جس پر فرشتے بھی ناز کریں تو چاہے۔ جو وقت وہ زبان
 مبارک سے۔ اپنے دلر بالہ جہ میں۔ دید کے رچاؤں کی تشریح کرنے لگتے۔ تو ہوا کی چڑیاں۔ اور کوہ
 بیاباں کے جانوروں اگر جمع ہونے گویا کسی نے اُپر جادو کر دیا ہے۔ درختو پنجا جھونکا بند ہو جاتا۔
 مانسرو کی لہریں تھم جاتیں۔ ساری فطرت پر ایک مدہوشی کا عالم چھا جاتا۔ کلام پاک کے ہر لفظ کی
 کرسٹہ ہیں۔ سوامی جی کے خیالات کیلاس کی چوٹیوں سے بھی زیادہ بلند اور گویا مانسرو کے سطح
 بلورین سے بھی زیادہ روشن تھے۔ حقائق معرفت پر جب تقریر فرماتے تو معنی کا دریا بہا دیتے۔
 اوب اور فلسفہ کے بادشاہ تھے۔ مبارک تھیں وہ راتیں جب سوامی جی ایک مرگ چھالے پر
 مانسرو کے لب آب لیٹتے۔ اور دیاس اور والیک کے پاکیزہ خیالات کی داد دیتے۔ حیرت
 تو یہ تھی کہ اس کنج عافیت میں بھی سوامی جی علم اور تہذیب کی تازہ ترین رفتار سے آگاہ تھے۔
 اور اکثر جدید علمی انکشافات اور نظری تحقیقات پر ایسے پروژن خیالات کا انہماک کرتے کہ پرتاپ
 دنگ رہ جاتا۔ اس کچی کے آستانے پر دنیا کے کتنے ہی علما و فضلانے جہ سائی کی تھی۔ اور
 کتنے ہی سیلح و مدبر فلسفی اور شاعر ہر سال اس مقام کی زیارت کو آیا کرتے تھے۔ یورپ کے
 مصلح ملی کی کتنی ہی گتھیاں اسی گیان سور کے کنارے سلجھانی گئی تھیں۔ اور تاریخ و فلسفہ کے
 کتنے ہی عقدے یہاں حل ہوئے تھے۔ پرتاپ چند کو یہاں یورپ کے بعض نامور علما سے ملنے کا
 اتفاق ہوا۔ اور بہت سی ایسی تعینین دیکھنے میں آئیں جو الہ آباد کے کتب خانوں میں بھی نظر نہ آتی تھیں۔

یہ اُن نذائین کی یادگاریں تھیں جو وقتاً فوقتاً یہاں اُسے ملتے۔ اور جب کبھی دنیا کے کسی حصہ میں کسی صیغہ علم پر کوئی سرے کے کتاب لکھی جاتی تو خود مصنف یا سوامی جی کا کوئی معتقد اُسے ضرور یہاں بھیج دیا کرتا۔ ایک بادشاہ تھا کہ اپنے تخت پر بیٹھا ہوا دور دورا ز کے ممالک سے علم و تحقیقات کے خراج لیا کرتا تھا۔ مادی سلطنت ایک محسوس ہے۔ مگر روحانی سلطنت دنیا سے بھی زیادہ وسیع۔ اور وسعت سے بھی زیادہ فراخ ہے۔ تخت زر نگار کی فقیری پورے کے سامنے کوئی ہمتی نہیں۔ پرتاپ چند نے اپنے عقل و ذہن کا دامن اس علم و ہنر کے کان سے خوب آزادی کے ساتھ بھرا۔ اور یورپ کے کئی زبانوں کا بھی ماہر ہو گیا۔

پانچ سال گزر گئے۔ گرمی کے دن تھے کہ وہ اور دریائے گرمی سے تنگ آ کر اپنے سفید لباس اتارنے شروع کر کے تھے۔ آسمان کا نیلا پن آنکھوں میں کھٹکا جاتا تھا۔ پار و نظرت و افریب ہریالی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک روز پرتاپ چند رگیان سرور کے کنارے لوگ سادھن میں مصروف تھا کہ سوامی جی نے منشی سچون لال سے کہا۔

”میرے خیال میں بالاجی کو اب یہاں زیادہ ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں کئی دن سے سوچ رہا ہوں کہ انھیں رخصت کر دوں۔ مگر اُن سے کچھ ایسی محبت ہو گئی ہے کہ جدائی کا خیال شاق گذرتا ہے۔ آپ کو میری اس کمزوری پر تعجب ہوتا ہو گا۔ مگر میں آج آپ سے کہتا ہوں کہ پرتاپ چند میرا بیٹا ہے۔“

سچون لال۔ (حیرت سے) ”اے!“

سوامی جی۔ ”اسی خیال سے آپ میری کمزوری معافی کے قابل سمجھیں۔ پہلے ہی جب میری نگاہ اُسکے چہرہ پر پڑی تو چرانی محبت تازہ ہو گئی۔ اور میں ضبط و استقلال سے کام لیتا تو یقین تھا کہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے۔ اور راز افشا ہو جاتا۔ آج پورے بیس سال گزرے

جب میں نے دنیا سے منہ موڑا۔ اس وقت کی تصویر آج بھی میری نگاہوں میں کھنچی ہوئی ہے۔ جب میں شام کے وقت سببا سے رخصت ہوا ہوں۔ پرتاپ چھ سالوں کا بھی نہوا تھا۔ وہ بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ میں نے اُسکے طرف آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا۔ اور ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ مگر پرتاپ کے سوا اور کون جان سکتا ہے کہ اُسے اپنے خیال سے دور رکھنے کے لئے میں نے کتنے ضبط اور ترک سے کام لیا۔ برسوں تک ہر دم اُس کی موہنی صورت آنکھوں کے سامنے پھرتی رہتی تھی۔ بارے ایشور کی دیا سے میں نفس پر غالب ہوا۔ اور اٹھارہ برسوں تک پرتاپ ایک لمحہ کے لئے بھی میرے دھیان میں نہیں آیا۔ مگر جوں ہی آپ کے ساتھ اُسے دیکھا پُرانی یاد تازہ ہو گئی۔ مجھے اپنے ویراگ پر گھنٹہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب مایا کا میرے دل میں گزر نہیں ہو سکتا۔ مگر بالاجی نے میرا یہ غور بچور چھوڑ کر ڈالا۔ میں اتنے دنوں کے یوگ سادھن کے بعد بھی آج ایک کمزور انسان ہوں۔ یہہ تعلق محض جسمانی نہیں۔ بلکہ روحانی ہوتا ہے۔ اور یوگ۔ تپ۔ ویراگ کوئی بھی اس تعلق کو نہیں توڑ سکتا۔“

سچیون لال۔ ”مہاراج! آپ نے جو کچھ کر دکھایا وہ بھی معجزہ سے کم نہیں سببا

صیبی دیوی۔ پرتاپ صیبا بیٹا ہر شخص نہیں تیاگ سکتا۔“

سوامی جی۔ ”متر یہ سب ایشور کی رہ چنا تھی۔ مجھے شروع ہی سے اپنے بھائیوں کی بھلائی کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ اور جو کچھ میرے کئے ہو سکتا تھا۔ اُس سے انکی خدمت کرتا رہتا تھا۔ مگر یہ دلی آرزو تھی کہ ایشور میرے گھر میں کوئی قوم کا ذاتی پیدا کرتا۔ ایشور سے ہمیشہ ہی پرار تھا کیا کرتا۔ آخر لکشی جی نے سببا کو درشن دیا۔ اور سببا نے مہاراجی سے منہ مانگا بردوان پایا۔ اسی رات کو مجھے بھی ویراگ کا سدا ہوا۔“

سجیون لالؔ ایشور کی سیلا پا رہے۔ اگر مہاراج ویراگ نہ پاتے تو بالاجی آج کس کی سرن لیتے۔

سوامی جیؔ بالاجی ابھی تہہ پر نہیں پہنچے ہیں۔ اور نہ میں انھیں جتنا مناسب سمجھتا ہوں۔
 درود وہ یہاں سے جانا ہرگز منظور نہ کریں گے۔ دیکھئے اس تھوڑی سی مدت میں انھوں
 نے کیسا حیرت انگیز کام کیا ہے۔ اس سن میں ایسا ضبط اور یوگ میں نہیں دیکھا۔
 مجھے فخر ہے کہ میں ایسے میٹے کا باپ ہوں۔

سجیون لالؔ پچھلے دنوں کونٹ پنڈل شام سے انھوں نے راج نیت پر جو مباحثہ کیا
 اُسے سنکر میں حیرت میں آگیا۔

سوامی جیؔ یہ کونٹ علما میں سر آبد روزگار سمجھے جاتے ہیں۔
 سجیون لالؔ مجھے لنکا میں ایک بار لانے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔

سوامی جیؔ خیر علم تو ایک ایسی چیز ہے جو شوق و شغف سے روز بروز ترقی پاسکتی ہے
 مگر اسوقت بالاجی کو ہمیشہ کے لئے رخصت کرنے سے پہلے میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں
 کہ انکے دل میں کمزوری تو نہیں باقی ہے مجھے تو یہ ہے کہ بعض آدمی مدت تک ویراگ
 میں رہنے کے بعد یکایک ناگفتہ بہ کمزور یاں کر بیٹھتے ہیں۔ خصوصاً اس ویراگی کے لئے
 جو دنیا میں رہ کر اُس سے الگ رہنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ انتہاء درجہ کے مضبوط دل کی ضرورت
 ہے۔ ہم اور آپ اس کنج خلوت میں بیٹھے ہوئے دنیا کی گمراہیوں اور لغزشوں سے
 بچے رہ سکتے ہیں۔ مگر پانی پر کنول بن جانا اس سے بدرجہا مشکل بات ہے۔

سجیون لالؔ مجھے یقین کامل ہے کہ کوئی دنیاوی طاقت بالاجی کو فرض اور حق کے راستہ
 نہیں پھیر سکتی۔

سوامی جیؔ خیال تو میرا بھی ایسا ہی ہے مگر یقین جب ہی ہو سکتا ہے جب ایک بار انھیں آزمالوں میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اُنکا یہ ضبط اور مرک ارادی ہے۔ یا طبیعت ثنائی۔ قوم کی خدمت پہلے تو ایک تپسیا معلوم ہوتی ہے۔ مگر دونوں کے ساتھ ناخداؔ قوم کا ظاہری اعزاز و اقتدار بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اُسکے روبرو بادشاہوں کی گردنیں بھی جھکنے لگتی ہیں۔ اور کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ جو آنکھیں شمشیر برہنہ کے سامنے بھی نہیں جھپکیں وہ نئے کلفام کے ایک پیالہ سے سرشار ہو گئی ہیں۔ اور جودل سفینوں اور آفتوں کے طوفان سے بھی نہیں ڈرے وہ مدارات و عنایات کے خوشگوار تھیکوں میں نہ سنبھل سکے۔“

سچیون لالؔ اسکا امتحان کیونکر ہو گا؟

سوامی جیؔ ہم اور آپ ملکر لالاجی کے نفس پر زور ڈالیں گے۔ آپ کو اسلئے شریک کرنا چاہتا ہوں کہ میں تنہا غالباً انکی آتما پر کچھ اثر نہ پہنچا سکوں گا۔ انکی یوگ شکتی اندلوں بہت بڑھی ہوئی۔ پر تاپ چندر گیان سرور کے کنارے اپنے خیال میں گمن مٹھا ہوا تھا کہ اسے کچھ غنودگی سی معلوم ہوئی۔ اور جھجائیاں آنے لگیں۔ مگر اُسنے چونک کر آنکھیں ملیں۔ اور اپنے خیالوں میں غرق ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُسپر پھر غنودگی کا غلبہ ہوا۔ اور آنکھیں جھپکنے لگیں۔ جیسے کوئی رات بھر کا جاگا ہوا آدمی صبح کے وقت نیند سے متوالا ہو جائے۔ پر تاپ کو تعجب ہوا کہ آج مجھے اتنی نیند کیوں آرہی ہے۔ اُسنے پانی کے چھینٹے منہ پر دیئے۔ اور دل میں مضبوط ارادہ کر لیا کہ اب نیند کو ہرگز نہ آنے دوں گا۔ لیکن آدھ گھنٹہ بھی نہ گذرا تھا کہ پھر وہی کیفیت ہوئی۔ آنکھیں خواہ گساں سے محذور ہو کر منہ نے لگیں۔ اور انگڑائیوں کے مارے اٹھنا ٹوٹنے لگے۔ پر تاپ کے سمجھ میں نہ آیا کہ میری یہ حالت کیوں ہو رہی ہے۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور کچھ دیر تک تیزی سے

ٹلتا رہا۔ بعد ازاں اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔

اس طرح غیند نے اسپرچھنا کام چلے گئے۔ ایک سے ایک پُر زور۔ گرساواں حملہ پرتاپ سے برداشت نہ ہو سکا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور گردن جھک گئی۔ اُسکی آہا اکی بار مغلوب ہو گئی۔

مدہوشی کا غلبہ ہوتے ہی پرتاپ چند رکوا یا معلوم ہوا کہ میں کسی پُر فضا باغ میں آ گیا ہوں۔ عنبریز ہوائیں چل رہی ہیں۔ اور ہر ایک درخت پر خوشترنگ۔ اور شیریں نوا چڑیا بیٹھی چہک رہی ہیں۔ ہوا میں کچھ ایسی فرحت ہے۔ طیور کے شیریں نوائوں میں وہ ستانہ پن اور پھولوں کی مہک میں وہ نشہ کہ دل و دماغ متوالے ہو گئے جاتے ہیں۔ بہار اپنی دلفریبیوں کے پورے سامان لیکر آ پہنچی ہے۔ پرتاپ متحیر تھا کہ میں اس جنت کدہ میں کیونکر آ پہنچا۔ ابھی تو میں گیان سرور کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ یہ سوچ کر اُس نے آنکھیں بھاڑ بھاڑ کر دیکھا۔ اور پختہ یقین کر لیا کہ یہ خواب نہیں ہے۔ ضرور میں بھٹک کر کسی کے باغچے میں چلا آیا۔

وہ ادھر ادھر و مشوں میں ٹٹلنے لگا۔ کہ دفعتاً ایک نازنین سایہ دار درختوں کی آڑ سے خراماں خراماں آتی ہوئی دکھائی دی۔ اُسپر حسنِ کار و پ تھا۔ اور نزاکت کا سنگار۔ وہ روشنی کی ایک تصویر معلوم ہوتی تھی۔ پرتاپ چند رکو دیکھتے ہی وہ ہٹسکی۔ اور جینم پُر خم سے دیکھ کر بولی ”پرتاپ!“

پرتاپ چند رنے سے پہچان لیا اور جی رانی تھی مگر اُس آنگل کجرجن سے بد جہانین تیز و زور بوجرن تمہاں کہاں رانی۔ ”جہاں تم ہو وہاں میں بھی ہوں۔ محبت نے تمہارا پتہ بتا دیا۔ اگر تم مہک بکر بھی پھول میں سما جاتے تو میں تمہیں صوفیہ مہکاتی تھیں شاید معلوم نہیں۔ میں نے دوسرا

جہنم لیا ہے“

پرتاپ۔ (حیرت سے) ”دوسرا جہنم“

برج رانی۔ ہاں ابکی میرا جہنم دیو لوک میں ہوا ہے۔ مگر یہاں بھی جب سے ہوش بٹھا لایا ہے
تمہارے بیوگ میں گھل رہی ہوں یہ میرے باپ کا بارغ ہے۔ تمہارا استخان یہاں سے
بہت قریب ہے۔ تحقیق معلوم نہیں مگر میں دن میں کئی بار تمہارے درشن کرتی رہی ہوں۔
میرے بھاگ اچھے کھٹے کہ اس لوک میں جہنم ہوا ایسے نے شاید میری آرزو میں پوری کر دینے
لئے مجھے تمہارے پہلو میں بھیجا ہے“

پرتاپ چندر۔ برج رانی! یہی باتیں زبان سے نہ نکالو۔ کیا تمکو نہیں معلوم کہ میرا تم سے ہمیشہ
پاک فعلق رہا ہے“

برج رانی۔ ”پیارے۔ ان خیالوں سے میرے ابھاگے دل کو شکین نہیں ہوتی۔ پریم کی لگ
نے نے ان سب خیالات کو جلا کر خاک کر دیا ہے۔ میں نے خیال کیا تھا کہ تم نظروں سے دور ہو جاؤ گے
تو دل تمہیں مجھادے گا۔ میں نے دل کو بہت سمجھایا۔ مدتوں تک شعر و سخن سے جی بھلاتی رہی۔
تم آج بھی لوگوں کو میرے کلام کا مدح پاؤ گے۔ میں نے شہرت اور عزت اور دولت سب پائی۔
اور سب سے جی سیر ہو گیا۔ مگر تمہاری محبت کا نقش دل سے نہ مٹا۔ دوسرا جہنم لیکر بھی انسی لڑو
میں گھلتی رہی۔ میں رسول سے یہی سوچ رہی ہوں کہ تمہیں اپنی واسستان غم سناؤں یا نہ سناؤں
کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ اگر محبت میں روحانی طاقت ہے تو ہم اور تم ضرور ملیں گے۔ کبھی سوچتی
کہ تم مجھے بھول گئے ہو گے۔ مگر دل کو کسی طرح نہ سمجھا سکی۔ آج مجبور ہو کر میں نے تم کو جاکر ملایا
پر رکھا اور تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔ تم میرے لئے جو فیصلہ مٹا سب سمجھو کہ میں نے کیا
ہوں۔ خواہ مجھے اپنے پہلو میں جگہ دو۔ خواہ خیال میں بھی نہ لاؤ۔ میں تمہاری سچا

ساتھ سب کچھ سننے کے لیے تیار ہوں۔ میرے پتا اس لوک کے راجہ ہیں۔ میرے سوا انکے کوئی اولاد نہیں۔ مگر میں سب تیاگ دوں گی۔ میں تمہارے ساتھ فاقے کروں گی۔ کوئیں سے پانی کھینچوں گی.....“

یہ کہتے کہتے برجمن کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اور گلاروند صہ گیا۔

پر تپا چندر عجیب محضے میں مبتلا تھا۔ برجمن نے اس کی محبت کا رنگ گایا تھا۔ اور یہ راگ سنکر ایسا کون مرد ہے جو مدہوش نہو جائے۔ وہ ذرا دیر کے لئے بالکل بے کیف ہو گیا۔ سوچنے لگا آہ! کیسی سچی محبت ہے۔ کیسی غیر فانی۔ کیسی پاکیزہ۔ کیسی بے غرض! برجمن تو سچ مچ دیوی ہے۔ تب انسانوں کی دیوی تھی۔ اب دیوتاؤں کی دیوی ہے۔ تو میرے لئے یہ بہشت اور یہ دولت اور یہ سکھ تیاگ دیگی! میں کیسے تیری اس محبت کی داد دوں۔ میں تجھے کیسے بتلا دوں کہ میں ان قربانیوں کے لائق نہیں ہوں۔

پر تپا چندر انھیں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے میں برجمن نے نزاکت سے اسکا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی ”پیارے۔ میں نے تم پر فیصلہ تو چھوڑ دیا مگر دل کا نپ رہا ہے کہ کہیں بے انصافی نہ کر بیٹھو۔ (ہاتھ جوڑ کر) ایسا کرنا! نہیں تمہاری برجمن مر جائیگی۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔ میں تم سے محبت نہیں مانگتی۔ میں تمہارا دل نہیں مانگتی۔ میں تم سے صرف تمہارے ساتھ رہنے کی۔ تمہاری خدمت کرنے کی اجازت چاہتی ہوں۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں مانگتی۔ تمہارا دل میرے مان کا نہیں۔ اُسے لینے کے لئے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میری محبت پر غرض ہے۔ جس وشباب چندر روزہ۔ دولت فانی۔

تمہاری محبت غیر محدود ہے.....“

پر تپا چندر کے جی میں آیا کہ اس...

جواب نہ لیا۔ برجن کی روحانی عظمت نے اُسے بالکل بہت کر دیا۔ قریب تھا کہ وہ اس خود فراموشی کے عالم میں اپنا بڑا پھول جاے۔ کہ یکایک سوامی برہمانند جی کا یہ قول اُسے یاد آگیا ”ہر نیک اور اعلیٰ کام کے راستے میں بڑے بڑے سخت امتحانات کا سامنا ہوتا ہے۔ وہی پورا مرد ہے جو ان امتحانات سے بے دلیغ نکل جاے۔ بسا اوقات یہ امتحانات رنگ و روپ بدل کر آتے ہیں۔ اس وقت ان سے مقابلہ کرنا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔“ اس قول کے یاد آتے ہی پرتاپ کا خیال کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ فردر میں اس وقت امتحان میں پڑا ہوا ہوں۔ وہی طاقت جو مجھے یوں پرکھ رہی ہے۔ برجن کے زبان و دل پر بھی اپنا جاو دو چلا رہی ہے۔ یہ خیال کرتے ہوئے اُس نے جواب دیا۔ ”برجن۔ مجھ میں یہ بیان کرنے کی طاقت نہیں کہ اس وقت تم سے ملکر طبیعت کیسی خوش ہوئی۔ مجھے فخر ہے کہ تم جیسی پاکیزہ اوصاف دیوی مجھے محبت رکھتی ہے۔ اس محبت کے مقابلہ میں میرے ہستی کی کچھ وقعت نہیں نکاش میں اس قابل ہوتا کہ اس انتہاء پریم کی کچھ قدر کر سکتا۔ مجھ جیسا مٹی کا انسان تمہارے لائق نہیں۔ میں تمہاری پرستش کر سکتا ہوں۔ مگر محبت نہیں میں تمہارے قدموں کی خاک پیشانی پر مل سکتا ہوں۔ مگر تمہاری پاکیزہ محبت کو اپنی بغیریت سے آلودہ نہیں کر سکتا۔“

بسج رانی کی آنکھوں سے آنسو کا دریا بہہ نکلا۔ ذرا دیر کے بعد بولی ”تمہارا فیصلہ مجھے برسرِ چشم منظور ہے۔ ایسا رتھیں سرسبز کرے۔ یہی میری دعا ہے۔ میرے لئے یہی خوشی کافی ہے کہ میری عزت اور محبت تمہارے دل میں موجود ہے۔ پرتاپ یقین سے اپنی خواہ غرضی پر نادم ہوں۔ محبت انسان کو خود غرض بنا دیتی ہے۔ میں تمہاری محبت کی طالب رہتی۔ میری یہ خواہش

نہ تھی کہ تمہاری محبت سے بہار زندگی لوٹوں۔ خیر نوشتہ تقدیر سے کیا چاہہاں
 التجاہیر ہے کہ اب میری یاد اپنے دل سے نکال دالنا۔ ایسا نہ کہ کسی وقت میری یاد تمہیں ستائے
 اور رلائے۔ ہاے اتم رو رہے ہو۔ پیارے رفوخت۔ ایسور کے لئے اپنے اوپر ایسا
 ظلم نہ کرو۔ ورنہ پرتاپ بچپتاؤ گے۔ تمہیں تجربہ ہو جائیگا کہ قوم کی خدمت۔ اور قوم کی محبت
 دل کے لئے کافی غذا نہیں ہے۔ تمہیں سب کچھ ملیگا۔ مگر برجن نہ ملیگی۔ مجھے پرماتما نے
 تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔ اُسے کیا جواب دو گے؟

پرتاپ نے روتے ہوئے جواب دیا۔ برجن میری پرتگیا مت توڑو۔ تمہارے
 روہر دیوں کھڑا کر میں اپنے برت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ مجھے اب رخصت کرو۔ میں
 جب تک زندہ رہوں گا تمہاری پریش کرتا رہوں گا۔ تمہاری یاد میرے دل سے نہیں نکل سکتی
 یہ کہتے کہتے دفوراشک سے اُسکی زبان بند ہو گئی۔ جب گھی خوب کھول جاتا
 ہے تو اُسکا بولنا بند ہو جاتا ہے۔ برجن نے سر جھکا کر اُسے پر نام کیا۔ اور نظروں سے
 غائب ہو گئی۔

شام کا وقت تھا۔ ہماچل سر پہ سنہراتاج رکھے کھڑا تھا۔ چڑیاں بسیرا لے رہی تھیں۔
 آسمان پر سے دو ایک شوق نظر تارے گھورنے لگے تھے۔ پرتاپ چندرنے دیکھا کہ برجن
 گیان سرور کے نیلگوں پانی میں کھڑی ہے۔ گویا جل دیوی اپنے سنگھاسن پر رونق افروز ہے۔
 اور ایسی آواز سے جیس کوئل کی کوک۔ پیپے کی ہوک اور شیشیا کی ہیک لی ہوئی ہے۔ یہ دوسو
 نغمہ الاپ رہی ہے۔

بن صری کیوں را کہیں من و میر
 گھر آنگن نہ سہات رین دن۔ بسرے بھو جن نیر

بن ہری کیوں راکھیں من دھیر

مچھلیاں روتی تھیں۔ اور پیڑ پتے سر دھنتے تھے۔ برجن کمر تک پانی میں چلی گئی۔ اور پھر یہ آواز آئی۔

پُن پُن وہی سُرت آوت۔ چت چت جمناتیر

بن ہری کیوں راکھیں من دھیر

برجن نے پرتاب چندر کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑے۔ پھر گلے تک پانی میں چلی گئی۔ ایک کُل کھل گیا۔ یہ آواز آئی۔

مت اچھس آہنوسر اپنے۔ کٹھن من کی پیہ

بن ہری کیوں راکھیں من دھیر

چند تارے کان لگائے سن رہے تھے۔ آسمان کی سُرخ میٹ چلی تھی۔

برجن نے پرتاب چندر کو پر نام کیا۔ اور پانی میں غوطہ لگایا۔ پور ناشی کا چاند دیکھتے دیکھتے ڈوب گیا۔ پرتاب دوڑا۔ مگر یہ لڑکھڑائے۔ اور بیوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔

چھبیسویں فصل

گنگا جمن کا ملاپ

—*—

ہمارے ناظرین مادھوی کے نام سے غیر مانوس نہونگے جس طرح ایک نگرینہ کسی پُرفن کاریگر کے ہاتھوں میں پڑ کر موتیوں کے قول بکنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح برج رانی نے مادھوی کو سکھاڑھا کر اپنا ہی سا بنالیا تھا اسکی خلقی تیکڑا جی اور شرافت کی دو ایک مثالیں برجین کے اُن خطوط میں ملتی ہیں جو اُس نے جھگڑاؤں سے کھلاچرن مرحوم کے نام لکھے تھے۔ کبھی کبھی جنگلی پھولوں میں وہ بوباس ساورنگ روپ مل جاتا ہے۔ جو سچی ہوئی روشوں اور مرصع کاریوں کو کبھی بیس نہیں ہو سکتا۔ مادھوی تھی تو ایک غریب جاہل برہمن کی لڑکی۔ مگر فطرت نے اُسے جس حسہ کے کل پاکیزہ اوصاف عطا کئے تھے۔ اور اُسیں تعلیم اور تربیت قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ مادھوی اور برجین کا ملاپ اُس وقت ہوا جب برجین سسرال آئی ساس بھولی بھالی لڑکی نے اس وقت سے برجین کے ساتھ غیر معمولی محبت ظاہر کرنا شروع کی معلوم نہیں اُسے دیوی سمجھی تھی۔ یا کیا۔ مگر کبھی اُسے برجین کے مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی گزرنے سے نہیں بچا۔ برجین بھی اُسے اپنے ساتھ ملاتی۔ کھلاتی۔ اور اچھے اچھے ریشمی کپڑے پہناتی۔ اس سے زیادہ محبت وہ اپنی چھوٹی بہن کی بھی نہیں کر سکتی تھی۔

دل کو دل سے لگاؤ ہوتا ہے۔ برجین کو سسرال میں آنے کے بہت پہلے ہی

معلوم ہو گیا تھا کہ میں ہی پرتاپ چندر کے خوابوں کی پری ہوں۔ اُسکی ایک ایک نظر میں۔ ایک ایک بات میں وہ اپنی محبت کی جھلک دیکھتی۔ اور افسوس کرتی۔ ایک روز جبکہ وہ کلاہرن کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اُسے یہ خیال کر کے ردنا آیا تھا۔ کہ میری قویوں نطفے سے گذرتی ہے۔ اور بیچارے پرتاپ کے دل پر نہ جانے کیا سیت رہی ہوگی۔ مادھوی اسوقت گیارہویں سال میں تھی۔ اور اُسکے رنگ و روپ کا نکھار۔ سلیقہ۔ گفتگو اور گن دیکھ دیکھ کر سب کو حیرت ہوتی تھی۔ برجن کو معاً خیال آیا کیا میری مادھوی اس قابل نہیں کہ پرتاپ اُسے اپنے گلے کا ہار بنائیں۔ اُس دن سے وہ مادھوی کی تربیت اور خاطر داری میں اور بھی زیادہ مہمک ہو گئی۔ وہ سوچ سوچ کر دل میں پھولی نہ سہتی کہ جب مینا سولہ سترہ سال کی ہو جائیگی اسوقت میں پرتاپ کے پاس جاؤنگی۔ اور اُس سے ہاتھ جوڑ کر کہوں گی کہ مادھوی میری بہن ہے۔ اُسے آج سے تم اپنی چیری سمجھو۔ کیا پرتاپ میری بات ٹال دینگے؟ نہیں ایسا وہ نہیں کر سکتے۔ مزہ تو جب ہے کہ چچی خود مادھوی کو اپنی بہو بنانے کی مجھ سے اہتدعا کریں۔ اسی خیال سے برجن نے پرتاپ چندر کے اوصاف حمیدہ کا نقش مادھوی کے دل میں جاننا شروع کر دیا تھا تاکہ اُسکا رویاں روایاں پرتاپ کی محبت میں سرشار ہو جاوے۔ وہ جب پرتاپ چندر کا بھان کرنے لگتی تو خود بخود اُسکے الفاظ غیر معمولی طور پر شیریں اور فصیح ہو جاتے۔ رفتہ رفتہ مادھوی کا بچہ دل چافنی اُلفت کے مزے لینے لگا۔ آئندہ میں بال پڑ گیا۔

بھولی مادھوی سوچنے لگی میں کیسی خوش قسمت ہوں۔ مجھے ایسا سوامی ملیگا جسکا

پیر دھونے کے لائق بھی بن نہیں ہوں۔ مگر کیا وہ مجھے اپنی چیری بنائینگے۔ کچھ ہو میں ضرور اُنکی رانی بنؤنگی۔ اور پریم میں کچھ کچھ آوے تو میں اُنھیں ضرور اپنا بنا لوں گی۔ مگر اُس غریب

برہم چند کے قصاصیہ دوسرے گور کی اور غمر انس
 کے دو بیٹے (کے) سے معمار ^{سور} کے ہیں۔

کیا معلوم تھا کہ یہ آرزویں حسرت بکرا نگہوں کے راستہ بہ جائیگی۔ اُسکا پندرہواں سال پورا
 بھی نہوا تھا کہ برجن پر خانہ تباہی کے صدمے آپڑے۔ اُس طوفان کے جھونکے نے مادھوی
 کے اس خیالی پھلواڑی کا ستیا ناس کر دیا۔ اسی اثنا میں پرتاپ چندر کے لاپتہ ہونے کی
 خبر ملی۔ طوفان نے جو کسر رکھ چھوڑی تھی وہ اس آگ نے جلا کر راکھ کر دی۔

گر خیال کوئی چیز ہے تو مادھوی خیال میں پرتاپ چندر کی بیوی بن چکی۔ اُس نے
 اپنا تن اور من اُنھیں سوپ دیا۔ پرتاپ کو خبر نہیں۔ مگر آج اُسے ایسی بیش بہا چیز ملی ہے
 جسکے مقابلہ میں دنیا کی کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔ مادھوی نے مرت ایک بار پرتاپ کو دیکھا تھا۔
 اور مرت ایک بار اُسکی امیت کی سی باتیں سنیں تھیں۔ مگر برجن کی شیریں بیانیوں نے اُسکے سینہ
 میں آگ کی وہ چنگاری ڈال دی تھی جو روئی کے قودے میں گھسکر اُسے جلا کر خاکستر کر دیتی
 ہے۔ پرتاپ کا پتہ نہیں ہے۔ مگر مادھوی اُسکی سوز محبت میں روز بروز گھلتی جاتی ہے۔
 اُس دن سے کوئی ایسا برت نہیں تھا جو مادھوی زکھتی ہو۔ کوئی ایسا دیوتا نہیں تھا جسکی
 وہ پوجا نہ کرتی ہو۔ اور یہ سب اس لئے کہ ایشور پرتاپ کو جہاں کہیں ہو۔ نیریت سے رکھے
 ان خیالات نے اُس لڑکی کو اور بھی زیادہ ممتین۔ نیک مزاج اور شریف بنا دیا۔ شاید اُس کے
 دل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میرا بیاہ پرتاپ چندر سے ہو چکا۔ برجن اُسکی یہ حالت دیکھتی۔ اور
 روتی کہ یہ آگ میری ہی لگائی ہوئی ہے۔ اب یہ بگل نورس کسکے گلے کا بار بنے گا۔ وہ کسی
 ہو کر پیگی۔ ہاے! جس بیچ کو میں نے اتنی محنتوں سے اُگایا۔ اور شہد اور دودھ سے سینچا۔
 اُسکا پھول اسطرح شاخ پر کھلایا جاتا ہے! برجن تو خیر شر و سخن میں اُلجھی رہتی یہی باغیچہ
 اُسکا ہدم اور پودے اُسکے مولس تھے۔ مگر مادھوی کو یہ مشغلہ کمال، اُسکے مولس اور
 ہدم مرت خیال یار تھا۔ اُس یار کا جو اتک اُسکے لئے بیگانہ صہرت سا ایک روز پرتاپ

چلے جانے کے بعد مادھوی نے خواب دیکھا کہ وہ سنیاسی ہو گیا ہے۔ آج مادھوی کا اکتھاہ پریم ظاہر ہوا۔ اُسے الہام سا ہو گیا کہ پرتاپ نے خرو سنیاس لے لیا لیکن وہ بھی تپوہنی بجلی۔ ذاتی آرام و آسائش کا خیال دل سے جاتا رہا۔

جب کبھی بیٹھے بیٹھے مادھوی کا جی بہت گھبراتا تو وہ پرتاپ چندر کے گھر جا بیٹھی۔ وہاں اُسکے دل کو ذرا دیر کے لئے لنگھیں ہو جاتی تھی۔ جب سے سبھا کو برجین کے خطوط کا بیاض ملا تھا۔ اُسکی زندگی نے عجیب روش اختیار کر لی تھی۔ غور و خوض اُسکے اوصاف کا مرکز خاص تھا۔ اُس نے اپنی پیشانی پر بل تک نہ آنے دیا۔ زبان سے افسوس و ملال کا ایک لفظ بھی نہ نکلنے دیا۔ نہ آنکھوں سے حسرت کے آنسو بہنے پائے۔ حسب معمول ٹھیکہ کا کارڈ باز کرتی رہی۔ بلکہ اب اور بھی مصروفیت و اہمیت کے ساتھ۔ ہاں اب بجائے بنیاد نگاہیت شعاری کے میزان میں فرائض کی لگتی تھی۔ یہ مکان مادھوی کے لئے ایک پاک مندر تھا۔ جب تک برجین اور سبھا کے دلوں میں گانٹھ پڑی ہوئی تھی وہ یہاں بہت کم آتی تھی۔ مگر جب ان کا برجین کی پاکیزہ شاعری۔ پاکیزہ خیالات اور پاکیزہ طرز زندگی نے دونوں عورتوں کے دلوں کی گانٹھ کھول دی اور گانٹھ جھٹکی طرح باہم گلے لگ گئیں تو مادھوی کی آمد و رفت بھی بڑھی۔ سبھا کے پاس دن کے دن بڑھتی رہ جاتی۔ اس گھر کی ایک ایک انگلی زمین پرتاپ چندر کی یاد گار تھی۔ اسی انگلی میں بالاجی نے کاٹھ کے گھوڑے دوڑائے تھے۔ اور اسی حوض میں کافہ کی ناویں چلائی تھیں۔ ناویں تو شاید زمانہ کے بھنور میں پڑ کر ڈوب گئیں۔ مگر گھوڑا اب بھی موجود تھا۔ مینا نے اُسکی بوسیدہ ہڈیوں میں جانڈا دی اور اُسے باغ میں حوض کے کنارے ایک گلاب کے سایہ میں باندھ دیا۔ یہی کرہ بالاجی کا آرام گاہ تھا۔ مادھوی اُسے اب اپنے دیوتا کا مندر سمجھتی ہے۔ اسی پلنگ نے بالاجی کو مدتوں تک

اپنے آغوش میں تھپک تھپک کر سلایا تھا۔ مادھوی اب اسے پھولوں سے سجاتی ہے کیا پلنگ
 نے ایسے دن بھی کبھی دیکھے تھے۔ مادھوی نے اس کرد کو ایسا آراستہ کر دیا جیسا وہ
 کبھی نہ تھا۔ تصویروں کے چہرہ پر سے گرد کا نقاب اٹھ گیا۔ لیمپ کے نصیب پھر روشن
 ہوئے۔ مادھوی کی اس ہمہ گیر محبت سے سبھا ماکا لفر بھی لوٹ گیا۔ مدت سے اُسکی زبا
 پر پرتاپ چندر کا نام کبھی نہیں آیا تھا۔ برجن سے میل جول بھی ہو گیا مگر دونوں عورتوں
 میں کبھی پرتاپ کا ذکر نہیں آیا۔ حیا برجن کی دامنگیر تھی۔ اور خود داری سبھا ماکے مگر مادھوی
 کے شعلہ محبت نے پتھر کو بھی گھلادیا۔ جب وہ ایک از خود فنگی کے عالم میں پرتاپ کے
 پیچھے کی باتیں پوچھنے لگتی تو سبھا ماسے ضبط نہوتا۔ اُسکی آنکھیں بھرا تیں۔ تب دو کی دونوں
 دیتیں۔ اور وہ دن بھر اُنکی باتیں ختم نہوتیں۔ کیا اب بھی مادھوی کا حال دل سبھا ماسے
 چھپ سکتا تھا۔ وہ اکثر سوچتی گلیا یہ تپوئیوں ہی محبت کی آگ میں جلتی رہیگی۔ اور پلائیسی
 اُمید کے!

آٹھ نو سال بیت گئے۔ ایک روز برج رانی نے مکلا کا چلیت کھولا تو سرورق پر ایک
 نہایت پُر جلال تصویر۔ کئی رنگوں میں بنی ہوئی نظر آئی۔ یہ کسی مہاتما کی تصویر تھی۔ اُسے
 خیال آیا کہ میں نے ان مہاتما کو کہیں فرور دیکھا ہے۔ سوچتے سوچتے یکایک اُسکا خیال پرتاپ چند
 تک جا پہنچا۔ فرط مسرت سے اُچھل پڑی۔ اور بولی۔ ”مادھوی۔ ذرا یہاں آ جا“
 مادھوی پھولوں کی کیاریاں سینچ رہی تھی۔ اُسکے دل پہلاؤ کا آجکل یہی مشغلہ تھا۔
 ساڑھی پانی میں لت پت۔ سر کے بال کبھرے۔ ماتھے پر پسینہ کی بوندیں۔ آنکھوں میں
 پریم سارس۔ اگر کھڑی ہو گئی۔ برجن نے کہا۔ ”آج تجھے ایک تصویر دکھاؤں“
 مادھوی۔ ”کسی تصویر ہے۔ دیکھوں“

مادھوی نے تصویر کو بغور دیکھا۔ اور آبدیدہ ہو گئی۔

برجن: ”پہچان گئی“

مادھوی: ”کیوں؟ یہ شکل میں کئی بار خواب میں دیکھ چکی ہوں۔ چہرہ سے تیج برس رہا ہے“

برجن: ”دیکھو کچھ حالات بھی لکھے ہیں“

مادھوی نے دوسرا ورق اُلٹا تو ”سوامی بالاجی“ کی مرنی نظر آئی۔

تھوڑی دیر تک دو کی دونوں۔ خاموش۔ محویت کی تصویر بنی ہوئی۔ یہ مضمون پڑھتی رہیں۔ بعد ازاں بات چیت ہونے لگی۔

برجن: ”میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ انھوں نے ضرور سنیا س لے لیا ہوگا“

مادھوی زمین کی طرف تاک رہی تھی۔ منہ سے کچھ نہ بولی۔

برجن: ”تب میں اور اب میں کتنا فرق ہے؟ چہرہ سے جلال برس رہا ہے۔ تب ایسے وجہ نہ تھے“

مادھوی: ”ہوں۔۔۔“

برجن: ”ایشور انکی مدد کرے۔ بڑی تمپیا کی ہے۔ (آبدیدہ ہو کر) کیا اتفاقات ہیں۔ ہم

اور وہ ساتھ ساتھ کھیلے۔ ساتھ ساتھ رہے۔ آج وہ سنیا سی ہیں۔ اور میں بروگن۔

نہ جانے انھیں ہم لوگوں کی کچھ سہ بھی ہے یا نہیں۔ جنے سنیا س لے لیا۔ اُسے

کسی سے کیا ناتا۔ جب بچی کے پاس ایک خط نہ لکھا تو بھلا ہماری یاد کیا باقی ہوگی۔

مادھوی: ”بچپن میں وہ کبھی جوگی جوگی کھیلتے تو میں مٹھائیوں کی بھکشا دیا کرتی تھی“

مادھوی نے رو کر کہا ”تو جانے کب درشن ہونگے“ یہ کہہ کر شرم سے سر جھکا لیا۔

برجنؔ۔ آئینکے جلد۔ راجہ دھرم سنگھ اور بھتیجا دونوں انہیں ضرور لائینگے۔

مادھوویؔ۔ ”ان دونوں آدمیوں نے بھی بڑے حوصلے کا کام کیا۔“

برجنؔ۔ کیسا کچھ! راجہ صاحب یہاں سے سیر کرنے گئے تھے۔ شاید نطاب کی آرزو کھینچ لے گئی تھی۔ انکی جائداد دو ڈھائی کروڑ سے کم کی نہیں۔ پچاس لاکھ تو سالانہ نفع ہے۔ انکا اس فراخ دلی سے ساری جائداد کا خریدا وقت کر دینا۔ اور اسکے ساتھ ساتھ اپنی زندگی بھی اپن کر دینا بڑا بھاری تیاج ہے۔ بھتیجا نے بھی نکل کا نام روشن کر دیا۔ مجھے انکی طرف سے ایسی امید نہ تھی۔“

مادھوویؔ۔ چندا بن آتی ہوئی۔“

برجنؔ۔ ہاں اب وہاں کیا کرینگی انہیں بھتیجا کا یہ کام شاید ہی پسند آیا ہو۔ جھلاتی ہوئی آن ہوئی۔“

مادھوویؔ۔ درشنوں کو لوگ بہت دور دور سے آئے تھے۔“

برجنؔ۔ تقریر کی کیسی تعریف کی ہے۔ انکی زبان میں تو پہلے ہی جامو تھا۔ اب کیا پوچھنا۔ بھتیجا کے دل پر جبکی تقریر کا ایسا اثر ہوا وہ ساری دنیا پر اپنا جامو پھیلا سکتا ہے۔“

مادھوویؔ۔ چلوچی کے یہاں چلیں۔“

برجنؔ۔ ہاں انکا تو خیال ہی نہیں رہا۔ دیکھیں کیا کہتی ہوں۔ خوش تو کیا ہوئی۔“

مادھوویؔ۔ انکی ڈا بھلا کھا ہی یہ تھی۔ خوش کیوں ہوئی۔“

برجنؔ۔ چل۔ ماں یہ فہر سنگر کبھی نہیں خوش ہو سکتی۔“

دونوں عورتیں گھر سے باہر نکلیں۔ دونوں حُسن کی رانی تھیں۔ برجن کو دیکھ کر

اکر آدمی مرتعظیم خم کرتے تھے۔ لوگ فرط ادب سے اُسکے سامنے سے ہٹ جاتے۔ خامن مام

میں اسکی یکساں عزت تھی۔

کوئی مادھوی سے پوچھے تیرے پیر اب زمین پر کیوں نہیں پڑتے۔ تیرے زرد
پہرے پر کیوں مسرت کی سُرخی جھلکا کرتی ہے۔ تجھے کونسی دولت مل گئی۔ تو اب متفکر
و معنوم نہیں نظر آتی۔ تجھے اپنے پیتم سے ملنے کی اب کوئی امید نہیں۔ تجھ محبت کی نگاہیں
کبھی نہیں پڑیں۔ تیرے کانوں میں محبت کی آوازیں کبھی نہیں پہنچیں۔ پھر تو کیوں بھولی
نہیں ساتی۔ اسکا جواب مادھوی کیا دیگی۔ کچھ نہیں۔ وہ سر جھکا لے گی۔ اسکی آنکھیں نیچے
جھک جائیں گی۔ جیسے ڈالیاں پھولوں کے بوجھ سے جھک جاتی ہیں۔ اور شاید آنسو کے
چند قطرے ٹپک پڑیں۔ مگر اسکی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلیگا۔

مادھوی محبت کے لبتے سے متوالی ہے۔ اسکا دل دیوانہ محبت ہے۔ اسکی محبت
بازار کا سودا نہیں۔ اسکا پریم کسی چیز کا بھوکا نہیں۔ وہ محبت کے عوالم محبت نہیں جانتی۔
اُسے ناز ہے کہ ایسے پاک منش آدمی کی صورت میرے دل میں جلوہ گریں ہے۔ اور یہی
اسکی دیوانگی۔ اُسکے پریم اُسکے عشق کا صلہ ہے۔

دوسرے مہینہ میں برج رانی نے بالاجی کے خیر مقدم میں ایک پُر زور نظم لکھی۔

یہ ایک شاعرانہ معجزہ تھا۔ جب یہ نظم شائع ہوئی تو ملی دنیا باوجود برجن کی روز افزوں
بلند پروازیوں سے مانوس ہونے کے بھرت میں آگئی۔ وہ طائر فکر جو شاعری کے آسمان
میں گڑھ ہوا سے بھی آگے نکل جاتا، اب کی تاریخ پر چکا۔ ایک ایک شعرا الہامی روشنی سے منور تھا۔

جن لوگوں نے وہ نظم پڑھی بالاجی کے خدائی ہو گئے۔ شاعر وہ شعبہ باز ہے جسکی پٹاری
میں بجائے سائبوں کے دل بند ہوتے ہیں۔

ستائیسویں فصل

تاریخ کا ایک ورق

— + —

ناظرین۔ بالاجی کے قومی کارنامے آپ کو تاریخ کے صفحات میں آبزر سے لکھے ہوئے ملیں گے۔ ہم نے ان صفحات میں اُن حالات اور واقعات کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا ہے جو اس کارنامے کے محرک ہوئے کسی گری ہوئی قوم کو ابھارنا بہت مشکل کام ہے۔ مگر اسکا صلہ بھی ساری دنیا کی دولت سے زیادہ گراں بہا اور بیش قدر ہوتا ہے۔ بالاجی کے نام پر آج مورخ کا قلم مہر کرنے لگتا ہے۔ شعرا اس کے نام پر بلند پروازیوں کے موتی تیار کرتے ہیں۔ ملک کے درو دیوار اسکا جس کا رہے ہیں۔ اسکا ذکر آتے ہی لوگوں کے سر تعظیم اٹھ جاتے ہیں۔ اور دل قومی جوش سے لہریں ہو جاتے ہیں۔

کسی گری ہوئی قوم کو ابھارنا آسان کام نہیں۔ مگر اسکا صلہ جنت کی نعمتوں سے بھی زیادہ حیات بخش ہوتا ہے۔ بچے ماں کی گود میں بالاجی کے کارنامے سنتے ہیں۔ اُسکی یاد دلوں میں حوصلہ اور بازوؤں میں قوت پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے نام سے بقیہاں بس ہی ہیں۔ اور وہ سب گاہیں مکمل رہی ہیں اس کے نام پر زبانیں فصاحت کے پھول چڑھاتی ہیں۔ اُمرا اپنے محلوں میں۔ اور غریبا اپنے جھونپڑوں میں اُس کے گن گاتے ہیں۔ اُس کی صورت آنکھوں سے نہیں اُترتی۔ اُسکی چرند اور پرند حوصلہ آواز اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ اُس کے خیالات آئینہ الی نسلوں کے دماغوں کو سنوار گئے

اور صدیوں تک اُسکے موطنوں کے لئے گنبد نور کا کام دینگے۔

دیکھئے ایک بے یار و مددگار شخص قوم کو اُبھارنے میں کما تھک کامیاب ہو سکتا ہے۔

اس کام کے راستہ میں دولت کی اور مددگار و نمکی کمی حائل نہیں ہو سکتی۔ روحانی قوت۔

درومند دل۔ وسیع ہمدردیاں۔ یہ ضروری سامان ہیں۔ ابھی بہت دن نہیں گزرے

کہ پرتاپ چند ایک گناہ آدمی تھا۔ آج اُس کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ کیا اُسکے پاس

قارون کا خزانہ تھا! پنگھٹ پر جب عورتیں کوٹھوں پر گھڑے رکھے پانی کے لئے آتی ہیں

تب بالاجی ہی کے چرچے ہوتے ہیں۔ اور اُنھیں کے جس گائے جاتے ہیں۔ اتنا ج کے

کھیتوں میں اُنھیں کی بڑائی ہوتی ہے۔ یہی قومی خدمتگذار کا انعام ہے۔ کلکتہ میں جب وہ

گئے تو پھولوں کی برکھا ہوئی۔ ہزاروں من پھول بیروں تلے روند ڈالے گئے۔ اُس دن

مسندوں میں دیوتاؤں کو پھولوں کی باس نہ ملی۔ رنگین مزارعوں کے گلے میں پھولوں کے

گجرے نہ دکھائی دیئے۔ اور حسینوں کی سچیں پھولوں سے نہ سجائی جاسکیں۔ مگر بالاجی کو

اس مالیش اور صوم و صام سے مطلق لچسپی نہ تھی۔ دوسرے دن جب وہ بھاگیرتھی کے

کنارے۔ پانی میں غروب آفتاب کی بہار دیکھ رہے تھے تو کئی عورتیں پانی بھرنے آئیں۔

اور گھڑوں کو پانی میں گھما گھما کر باتیں کرنے لگیں۔

ایک نے کہا ”بہن تو نے سنا نہیں۔ بالاجی کسے ہیں“

دوسری بولی ”ہمارے ایسے بھاگ کمان کہ اُنکے درشن ملیں“

تیسری بولی ”تو چلنے پر راضی ہو تو میں تیرے ساتھ چلوں۔ وہ آج اپنا گونڈا

دیکھنے آئیگے۔ کون دور ہے مجھے گودوں کے لئے کھلی اور دانہ بھی لیجا تا ہے۔ ایک پتھر

دو کاج ہو جائے گا“

چوتھی بولی۔ ایسے دیوتا کے درشن نہ کیگی تو بڑا پاپ ہوگا۔ ویکھ جب سے اُن کا
گوشتالہ کھلا ہے لڑکوں کو دودھ پینے کو مل جاتا ہے۔ نہیں تو روکھی روٹی کو
ترتے تھے۔

بالاجی نے یہ باتیں سنیں۔ اور بھاگ کر مٹی کے گلتار پانی کی طرح چہرہ سُرخ ہو گیا۔
اُنھوں نے گائوں گائوں گوشتالے کھلوا دیے تھے۔ اُنکا سدھانت تھا کہ ہماری قومی
تباہی اور زوال کا اصلی سبب ہمارا جسمانی ضعف اور ذالوت کی بجا تفریق ہے۔ جب ہمارے
بچے روکھی روٹیوں کو ترستے ہیں۔ اور دودھ گھی کی خوشبو بھی اُنکے ناک تک نہیں پہنچتی
تو کوئی تعجب نہیں کہ اُنکے قوائے ایسے ضعیف۔ پھرے ایسے پژمردہ اور اعضا ایسے کمزور
ہیں۔ بلند ارادے اور اوپن خیالات چوڑے سینوں اور مضبوط مٹھائیوں میں رہا کرتے ہیں۔
جب قوائے جسمانی کا یہ حال ہے تو خیالات کیسے اوپن آئیں۔ استقلال کہاں سے آئے۔
جرات کہاں سے پیدا ہو۔ پھول کیسے کھلیں جب بڑے کو غذا انہیں پہنچتی۔ پھل کہاں سے
آئیں جب بیڑ سوکھا جاتا ہے۔ زمین کو ترک کر دو۔ اُسیں پانس ڈال دو۔ پھر دیکھو کہ کیسے خوش
اور خوشبودار پھول کھلتے ہیں۔ اور کیسے لذیذ اور سیلے پھل لگتے ہیں۔ جسمانی ضعف سے
زیادہ ہییب قومی دشمن وہ شرمناک حقارت ہے جس سے ہم اپنے بھائیوں کو دیکھتے ہیں۔
ہم نے بچی اور اوپن ذائقہ مقرر کر رکھی ہیں۔ اور نظرت کے اس زبردست قانون کی خلاف
ورزی کر رہے ہیں۔ کہ خلقت بتدیج ترقی کرتی ہوئی اعلیٰ تر ماسچ پر پہنچتی ہے۔ آج تک
جتنے رشتی اور مہاتا ہو گزرے ہیں اُن سیموں نے آریہ ورت سے اس تفریق کے مٹانے کی
کوششیں کی ہیں۔ مہاتا بڑے وہ پہلے بزرگ تھے جنہوں نے ہندو کی پیشانی پر سے
اس بے انصافی اور ظلم کا دغ مٹانا چاہا۔ اور اُنھیں بہت کچھ کامیابی ہوئی۔ اُنکے بعد

سری شنکر۔ سری رامانج۔ سری جیتن۔ سری رام کرشن۔ سری سوامی دیانند اور
 سوامی رام تیرتھ سبھی مہاتماؤں نے یہی تعلیم دی کہ اپنے بھائیوں کو اپنا بھائی سمجھو۔
 جاہل بھائی بھی تمہارا بھائی ہے۔ اور نادار بھائی بھی تمہارا بھائی ہے۔ اُسے حقیر مت سمجھو۔
 تمہاری نجات اتفاق سے ہوگی۔ تفریق سے نہیں۔ جو شخص اپنے ہموطنوں پر حقارت
 کی نگاہ ڈالتا ہے وہ کبھی ترقی کے زینہ پر نہیں چوہنچ سکتا۔ پیارو! جب تک ایک چار کے
 سامنے برہمن سر تعظیم جھکانا نہ سیکھیگا اس وقت تک قوم کی ناؤ ہرگز نہ پار لگیگی۔ یقین مانو۔
 تمہاری ناؤ جگہ سے ایک انگل بھی نہ ٹیلیگی۔ تمہارے ڈانڈے ٹوٹ جائینگے۔ تمہارے
 بادبان پھٹ جائینگے۔ اور تمہارے ملحق بانپ بانپ کر بیدم ہو جائینگے۔

یہ بالاجی کے خیالات ہیں۔ افسوس ہے کہ انکی زندگی نے وفا کی۔ ورنہ وہ ہندوستان
 کے لئے کیا کچھ نہ کر جاتے۔ تاہم جو کچھ انھوں نے کیا اُس پر ہر ایک ہندوستانی فخر کر سکتا ہے۔
 ایسا کون سا گلہ ہے جہاں بالاجی کا گوشا نہ قائم ہو۔ ہندوستان کی چپہ چپہ زمین کو
 انھوں نے اپنے قدموں سے روشن کیا۔ پونا۔ بمبئی۔ مدراس۔ میسور۔ کلکتہ گجرات جیسے
 جیسے دور دراز جگہوں میں مہینوں رہے۔ اور اپنی بلند آواز سے سوئی ہوئی آتماؤں کو جگاتے
 رہے۔ چھ ہفتہ کی کوشش میں انھوں نے صرف میسور میں کم دیش تین ہزار گوشائے کھلا
 دیئے۔ آفتاب کی چمک سے پانی میں بھی ایسی چمک آجاتی ہے کہ آنکھیں نہیں ٹھہرتیں بالاجی
 کا جوش۔ اور حوصلہ دوسرے کو سرگرم۔ پُر جوش اور حوصلہ مند بنا دیتا تھا۔ جہاں جہاں
 بالاجی نے گوشائے قائم کئے وہاں خود بخود اکھاڑے بنگے میں حتم کی خوش آئند صدائیں
 صبح کو مبارکباد دیتی ہیں۔ اور لٹکار کی پُر جوش آوازیں درختوں کو فیندے جگاتی ہیں۔
 ذات کی باہمی تفریق مٹانے کے لئے انھوں نے جو زبردست کوششیں کیں وہ صفحہ

تاریخ کے لئے ہمیشہ باعث ناز رہیگی۔ وہ مبارک گھڑی تھی جب اُنھوں نے پٹنہ میں ”ارجن سبھا“ کی بنیاد ڈالی۔ تین سال کے اندر ایسا شاید ہی کوئی شہر یا گاؤں تھا جہاں ارجن سبھا کی شاخیں نہ کھل گئی ہوں۔ یہاں ارجن سبھاؤں کی کوششوں کا پھل ہے کہ آج ہر قصبہ میں نیچی ذاتوں کے لئے جد اجداد سے۔ جد اجداد اور ڈھنگاؤں قائم ہیں ارجن سبھا کے ممبران مدرسوں میں تعلیم دیتے ہیں۔ اور ان ذاتوں کے ذہن اور معاشرت کے عیوب کی اصلاح کرنے میں سرگرم ہیں یہ لوگ گاؤں گاؤں گھومتے ہیں۔ اور ہندو قوم کے مظلوموں کو بیداری کا مزہ دے سکتے ہیں۔ اُن سے بھائیوں کی طرح انگلیگر ہوتے ہیں۔ اور ان کے دلوں میں خودداری کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ مبارک اور جاں بخش ہوتا تھا وہ نظارہ جب بالاجی اپنے مظلوم بھائیوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر انکا دل اور حوصلہ بڑھانے کی باتیں کرتے تھے۔ آج بالاجی کا نام سُکر یہ لوگ پھولے نہیں سماتے۔ ان لوگوں میں اخلاق و عادات کے سُدھارنے کی جو کوشش آپ دیکھتے ہیں یہ بالاجی ہی کی جانتشانیوں کا نتیجہ نیک ہے۔

ہمارے قومی کاموں کا ایسا کوئی جزو نہیں ہے جو بالاجی کی عنایت کا ممنون نہ ہو۔ اُنکا وقت۔ اُنکا دھیان۔ اُنکی سرگرمی اور اُنکا سب کچھ قوم کی خدمت کے لئے وقف تھا۔ وہ قوم کے سرتاج۔ اور قوم کے چاکر دونوں ہی تھے۔

اٹھائیسویں فصل

بنارس میں آمد

— + —

جب سے شہرت نے برج رانی کو اپنا منظور نظر بنایا تھا اُسکے یہاں ہر دم عورتوں کا جھگٹ لگا رہتا تھا۔ شہر میں مستورات کی کئی سبھائیں تھیں۔ اُنکے متعلق سارا بوجھ اُسکی اٹھانا پڑتا۔ اُسکے علاوہ دوسرے شہروں سے بھی اکثر عورتیں اُسکے ملاقات کو آتی رہتی تھیں۔ جو تیرتہ جاتا کرنے کے لئے بنارس آتا تھا وہ برجن سے فخر ملاقات کرتا۔ راجہ دھرم سنگھ نے اُسکے کلام کا مجموعہ بڑی آب و تاب سے شائع کیا تھا۔ اور اس مجموعہ نے اُسکی شاعرانہ سطوت کا ڈنکا بجا دیا تھا۔ ہندوستان کا تو کیا شمار۔ یورپ اور امریکہ کے سربراہ اور وہ شعرا نے بھی اُسے اُسکی محاسن کلام پر مبارکباد دی۔ ہندوستان میں شاید ہی ایسا کوئی خوش مذاق شخص ہوگا جسکے کتابوں کا طاق اس دیوان سے آراستہ نہ ہو۔ اور برجن کے کلام کی قدر کرنے والوں میں بالاجی کا درجہ سب سے بڑھا ہوا تھا۔ وہ اپنی پُر زور تقریموں اور تحریروں میں اُسکے کلام کی سندیں دیا کرتے تھے۔ اور ایک بار سرسوتی میں اُسکی پُر زور تنقید لکھی تھی۔ ایک روز برجن صبح کے وقت ٹیٹھی ہوئی تھی۔ کہ سیتا۔ چند کنور۔ رکنی اور رانی آئیں۔ چند کنور زیوروں سے لدی ہوئی۔ سیتا متین اور خاموش رکنی کا چہرہ بزمرد۔ الوداع شہاب کی تصویر۔ اور رانی ناک چوٹی سے درست۔ عطر میں ڈوبی ہوئی۔ چند رائے

ان عورتوں کو فرش پر بیٹھایا۔ اور انکی خاطر مدارات کی۔ برجن نے صبح کا وقت فکر سخن کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ اسوقت وہ بلا کسی خاص ضرورت کے سکھیلوں سکھیلوں سے نہ ملتی جلتی تھی۔ باغچہ میں ایک خوبصورت کنج تھا۔ گلاب کی خوشبو سے بسی ہوئی ہوائیں آتی تھیں۔ وہیں برجن ایک قالین پر بیٹھی ہوئی فکر سخن کیا کرتی تھی۔

اور بکر معنی سے جو موتی وہ نکالتی انھیں مادھوی سلک رقم میں پرو دیا کرتی۔ آج بہت دنوں کے بعد۔ اور اہل شہر کے متواتر تقاضوں پر برجن نے بالاجی کو بنارس میں آنیکی دعوت دینے کے لئے قلم اٹھایا تھا۔ بنارس ہی وہ شہر تھا جسکی یاد کبھی کبھی بالاجی کو بے پین کر دیا کرتی تھی۔ مگر باوجود اہل بنارس کے مسلسل دعوت اور امر کے انھیں بنارس آنے کی کبھی فرصت نہ ملی۔ سیلون اور رنگون تک گئے۔ مگر بنارس کی طرف رُنج نہ کیا۔ اس شہر کو وہ اپنا امتحان کدہ سمجھا کرتے تھے۔ اسی لئے آج بھجن انھیں بنارس آنے کی دعوت دیر ہی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دعوت انھیں ضرور کھینچ لائیگی۔ جب کوئی تازہ خیال آجاتا ہے تو برجن کا چاند سا چہرہ چمک اٹھتا ہے۔ اور مادھوی کے چہرہ پر سُرخ کی جھلک آجاتی ہے۔ باغچہ میں گلاب کے بہت پھول کھلے ہیں۔ رات کی شبہم میں نکھر کر وہ اسوقت بہت سہانے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اسوقت جوانی اور سہانا پن ان دونوں پھولوں پر ہے اُسے دیکھ دیکھ کر دوسرے پھول شرمائے جاتے ہیں۔ دونوں پھول باغ فردوس کے پھول ہیں۔

مگر نہیں ہم بھولتے ہیں۔ ایسے سُن دلا دیز کو پھول سے کیا نسبت۔ پھول میں وہ دلا دیزی کہاں وہ رس کہاں وہ کشش کہاں کسی نے لیا پھول کیا ہے جسے دیکھنے سے کبھی آنکھیں آسودہ نہوں۔ اور دیکھنے کی ہوس باقی رہے۔ ایسا پھول کہاں ہے جسے دیکھ کر

حل پر ایک بجلی سی کو نہ جاے۔ جبکی صورت دل پر نقش ہو جاے۔ شعرا نے پھول کا ترہ
 بڑھا رکھا ہے۔ پھر کیا اس حُسن کو چاند سے تشبیہ دیں۔ آہ! یہاں بھی شاعروں نے
 ٹھوکر کھائی ہے۔ چاند میں وہ دلفریبی کہاں۔ چاند میں روشنی ہے۔ چمک ہے۔ مگر حُسن
 کہاں۔ کیا چاند بھی ایسی چیز ہے جسے دیکھنے سے جی نہ بھرے۔ کیا چاند بھی جگر کو سوتے
 لگتا ہے۔ کیا چاند کو دیکھ کر بھی ریح پر ایک ترہ سا ہو جاتا ہے۔ حق یہ ہے کہ حُسن کی تشبیہ
 دنیا کی کسی چیز سے نہیں کی جا سکتی۔ کسی چیز میں یہ کشش۔ یہ اثر۔ یہ دلاویزی نہیں۔
 تو بجتے بجتے برجن کرہ میں آئی۔ سیونی بولی ”آج بڑی دیر لگائی۔“

برجن۔ ”لنتی نے سونج کے بلانے کے لئے لنتی پسپا کی تھی“

سیتا۔ ”بالاجی بڑے بھڑے ہیں۔ میں تو ایسے آدمی سے کبھی نہ بولوں“

رکمنی۔ ”جسے سنیا س لے لیا اُسے گھر بار سے کیا تاھا“

چندر کنور۔ ”یہاں آئیگے تو میں منہ پر لہد دنگی کہ حضرت یہ معشوقہ انکار کہاں سیکھا“

رکمنی۔ ”ہمارا ننی رشی مہاتما تو انکا تو ادب کیا کرو۔ زبان کیا ہے کرتی ہے“

چندر کنور۔ ”اور نہیں کب تک سہر کرے جی۔ سب جگہ جاتے ہیں ہمیں اُسے پیر پھلتے ہیں“

برجن۔ ”مسکرا کر“ اب بہت جلد درشن پاؤ گی۔ مجھے یقین ہے کہ اس مہینہ میں

وہ مزدور آئیگے۔“

سیتا۔ ”دھنیہ بھاگ کہ درشن تو ملیگے۔ میں تو جب اُنکا حال پڑھتی ہوں تو یہی جی

چاہتا ہے کہ پا جاؤں تو پیر پکاؤں کر گھٹنوں۔ روؤں۔“

رکمنی۔ ”ایسور نے انکے ہاتھوں میں بڑا جس دیا ہے۔ درانگر کی رانی صاحبہ مرہی

چکی یقین۔ یقین مانو دم ٹوٹ رہا تھا کہ بالاجی کو خبر ہوئی۔ فوراً پوسچے۔“

اور دم کی دم میں اٹھٹھاکر بٹھا دیا۔ ہمارے فشی جی دشوہرا ان دونوں وہیں تھے۔
 کہتے تھے کہ رانی جی نے خزانہ کی کھنچی لیکر بالاجی کے پیروں پر رکھ دی۔ اور کہا
 آپ اس کے مالک ہیں بالاجی نے کہا مجھے خزانہ درکار نہیں۔ آپ اپنی ریاست میں
 تین سو گوسفالے کھلوا دیجئے۔ زبان سے نکلنے کی دیر تھی آج وارا نگر میں دودھ
 کی ندی بہتی ہے۔ ایسا مہاتا کون ہوگا۔

چند رکنور راجہ نو لکھا کا تپ وق انھیں کی بوٹیوں سے چھوٹا۔ سارے حکیم
 ڈاکٹر جواب دیکھتے تھے۔ جب بالاجی چلنے لگے تو معرانی صاحب نے نو لکھا
 کاموٹیوں کا ہار ان کے پیروں پر رکھ دیا۔ مگر اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔
 رانی۔ عجیب مردہ طبیعت کے ہیں!

رکنی۔ ہاں اور کیا۔ انھیں چاہئے تھا کہ ہار لے لیتے۔ بلکہ گلے میں ڈال لیتے۔
 برجن۔ نہیں لیکر رانی کو پہنا دیتے۔ کیوں سکھی؟
 رانی۔ ہاں میں اس ہار کے لئے غلامی لکھتی تھی۔

چند رکنور۔ ہمارے یہاں تو ارجن سبھا کے ممبر بن بیٹھے ہیں۔ ڈھائی سو روپیہ
 لاکھ جتن کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ اسے اٹھالے گئے کہ گھوڑا لیں گے۔ کیا ارجن
 واسے بلا گھوڑے کے نہیں چلتے۔

رانی۔ کل یہ لوگ قطار باندھ کر میرے مکان کے سامنے سے جا رہے تھے۔ بڑا
 اچھا معلوم ہوتا تھا۔

اسی اثنا میں سیوتی تازہ اخبار لائی۔

برجن۔ کوئی نئی خبر ہے؟

سیوتی۔ ہاں بالاجی مانکپور آئے ہیں۔ ایک اہیر نے اپنے لڑکی کی شادی کا نوید بھیجا تھا۔ اسپرال آباد سے ارجن سجھا کے ممبروں کے ساتھ راتوں رات مانکپور پہنچے۔ اہیروں نے بڑے جوش سے خیر مقدم کیا ہے۔ اور ملکر پانچ سو گائیں بھینیں بھیٹ دی ہیں۔ بالاجی نے دلہن کو دھادی۔ اور دولہا کو گلے لگایا۔ پانچ اہیر ارجن سجھا کے ممبر بنائے گئے۔

برجن۔ ”نہایت دلچسپ خبر ہے۔ مادھوی اسے کاٹ کے رکھ لینا۔ اور کچھ؟“
سیوتی۔ پٹنہ کے پاسیوں نے ایک ٹھاکرہ دوڑا ہوا ہے۔ پٹنہ کی ارجن سجھانے بڑے دھوم دھام سے اُسکا جلبہ کیا۔

برجن۔ ”پٹنہ کے لوگ خوب سرگرمی سے کام کر رہے ہیں؟“
چندر کنور۔ کیا سوریں بھی اب سینڈور ہیننگی۔ پاسی ٹھاکرہ دوڑا ہے بنوائیں گے۔
رکمتی۔ کیوں وہ آدمی نہیں ہیں۔ ایٹھوڑے انھیں نہیں بنایا۔ آپ ہی اپنے مالک کی پوجا کرنا جانتی ہیں۔

چندر کنور۔ چلو ہٹو۔ پاسیوں سے مجھے ملاقی ہو۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔
رکمتی۔ ہاں تمہارا رنگ ذرا صاف ہے نہ۔ اور گہنے کپڑے سے لیس ہو۔ بس اتنا ہی فرق ہے کہ اور کچھ۔

چندر کنور۔ اتنا ہی فرق کیوں ہے۔ زمین کو آسمان سے ملاقی ہو۔ میں کچھ واہوں کی خانقاہ میں ہوں۔ معلوم ہے؟

رکمتی۔ ہاں معلوم ہے۔ اور نہیں معلوم تھا۔ تو اب معلوم ہو گیا۔ ٹھاکرہ صاحب کسی ہی سے بد بد کرکشی لڑیں گے؟ یا سر پڑھیں گے یا کچھ اور کچھ جانتے ہیں۔ میں تو

جانتی ہوں کہ کوئی معمولی پاسی بھی انہیں لغل میں دبا لیگا۔“

چندر کنورؒ منہ میں زبان ہے جو چاہے کہ لو۔ ہمارے باوا بے پور میں صوبہ دار تھے۔
ہلوگوں کی پیر تا دنیا میں مشہور ہے۔“

برجنؒ۔ اچھا اب اس قضیہ کو جانے دو۔ تم دونوں جب آتی ہو لڑتی ہی آتی ہو۔
ایک مہینہ اور گزرا۔ برجن کی تازہ نظم غیر مقدم کا پیغام لیکر بالاجی کے پاس پہنچی۔
مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ انہوں نے دعوت قبول کی یا نہیں۔ اہل بنارس راہ دیکھتے دیکھتے
تھک گئے۔ بالاجی روز بروز دکھن کی طرف بڑھتے جاتے تھے۔ آخر لوگوں کو مایوسی سی
ہو گئی۔ اور سب سے زیادہ مایوسی برجن کو ہوئی۔

ایک روز جب کسی کو سامان و گمان بھی نہ تھا کہ بالاجی بنارس آئینگے پران ناٹھ
نے آکر کہا تھا۔ لو خوش ہو جاؤ۔ آج بالاجی تشریف لارہے ہیں۔“

برجن کچھ لکھ رہی تھی۔ ہاتھ سے قلم چھوٹ پڑا۔ مادھوی اٹھ کر روانہ کی طرف
لیکی پران ناٹھ نے مسکرا کر کہا ابھی آتھوڑے ہی گئے کہ یوں بے صبر ہوئی جاتی ہو۔
مادھویؒ کب آئیں گے؟ اوہری سے ہو کر جائینگے نہ؟

پران ناٹھؒ۔ یہی تو نہیں معلوم کہ ہر سے آئینگے۔ انہیں جلوس اور دھوم دھام
سے سخت نفرت ہے۔ اسی لئے پہلے سے آنے کی تاریخ نہیں مقرر کی۔ راجھا صاحب
کے پاس آج صبح کو ایک آدمی نے آکر خبر دی کہ بالاجی آرہے ہیں اور کہا ہے
کہ میرے استقبال کے لئے دھوم دھام نہو۔ مگر بیاں بنارس کے لوگ اسے
کب مانتے ہیں۔ استقبال ہوگا۔ اور دھوم کے ساتھ جلوس نکلیگا۔ اور ایسا شادی
کہ شہر کی تاریخ میں یاد رکھنے کے قابل۔ چاروں طرف آدمی چھوٹے ہوسے ہیں

کہ جوں ہی انھیں آتے دیکھیں ہر ایک محلہ میں ٹیلیفون سے خبر پہنچا دیا۔
 کالج اور اسکول کے طلباء و دیاں پہنے برقیں لئے اشارہ کے منتظر ہیں۔
 گھر گھر پھول برسائے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بازار میں دوکانیں سجائی جا رہی
 ہیں۔ شہر میں ایک بالبل سی مچی ہوئی ہے۔

ماوصیؑ: ”ادھر سے جائینگے تو ہم انھیں روک لیں گے۔“
 پران ناٹھ: ”ہم نے کوئی تیاری تو کی ہی نہیں۔ روک کیا لیں گے۔ اور یہ بھی تو نہیں
 معلوم کہ کدھر سے جائیں گے۔ رادھا چرن نے دھوکا دیا۔ انھوں نے کہا تھا
 کہ میں امرتسر کی طرف سے اُنکے آنے تک لوٹ آؤں گا۔ اور ابھی تک اسکا کہیں پتہ
 نہیں۔ خیر۔“

برجن۔ (سو جھک) ”آرئی اُتارے کا انتظام تو کرنا ہی ہوگا۔“

پران ناٹھ: ”ہاں اب کیا اتنا بھی ہوگا۔ میں باہر فرش وغیرہ بچھواتا ہوں۔“
 پران ناٹھ باہر تیاریوں میں مصروف ہوئے۔ ماوصی پھول چنے لگی۔ برجن نے
 رو پہلا تھال دھو دھا کر صاف کیا۔ سیوتی اور چندرا اندر سب چیزیں قریب سے رکھے لگیں۔

ماوصی خوشی کے مدے پھوئے نہ ساقی تھی۔ بار بار چونک چونک کر دروازہ کی طرف
 دیکھتی کہ کہیں وہ آ تو نہیں گئے۔ بار بار کان لگا کر سنتی کہ کہیں باجے کی آوازیں تو نہیں آ رہی
 ہیں۔ دل مارے خوشی کے دھڑک رہا تھا۔ پھول چنتی تھی۔ مگر دھیان دوسری طرف تھا۔
 ہاتھوں میں کتنے ہی کاٹے چھجائے۔ پھول کے ساتھ کئی پٹروں کی شاخیں مڑوڑ
 ڈالیں۔ کئی دفعہ شاخوں میں الجھ کر گری۔ کئی دفعہ سادھی کانٹوں میں پھنسا دی۔
 اسوقت اُسکی حالت بالکل بچوں کی سی تھی۔

مگر برجن کا چہرہ بالکل اُداس تھا۔ جیسے بھرا ہوا پیالہ ذرا سا ہلنے سے بھی چھلک پڑتا ہے۔ اسی طرح جوں جوں پُرانی باتیں یاد آتی تھیں اُسکی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے تھے۔ اُہ کبھی وہ دن تھے کہ ہم اور وہ بھائی بہن تھے۔ ساتھ کھیلے تھے۔ ساتھ رہتے تھے۔ یا آج سولہ سال گزر گئے اُنکی صورت دیکھنی بھی نصیب نہ ہوتی۔ تب میں ذرا بھی روتی تو وہ میرے آنسو پوچھتے۔ اور میل اُدل بہلاتے۔ اب اُنھیں کیا خبر کہ یہ آنکھیں کتناروتی ہیں۔ اور اس دل نے کیسے کیسے مددے اُٹھائے ہیں۔ کیا خبر تھی کہ ہماری قسمیں ایسے گل کھلائیگی۔ ایک بیوگن ہو جائیگی۔ اور دوسرا سنیا سی۔

یہ ایک مادھوی کو خیال آیا کہ سُبھا کو شاید بالاجی کے آنے کی خبر نہ ہوئی ہو۔ برجن کے پاس آکر بولی ”بہن ذرا میری چچی کے یہاں جاتی ہوں۔ نہ جانے کسی نے اُنسے کہا یا نہیں“

پران ناٹھ باہر سے آرہے تھے۔ یہ سنکر لوہے۔ ”وہاں سویرے ہی سب سے پہلے خبر ہو گئی۔ خوب تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بالاجی بھی سیدھے گھر ہی کی طرف جائینگے۔ اور سے اب نہ آئینگے۔“

برجن۔ ”تو ہم لوگوں کو چلنا چاہئے۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔“
مادھوی۔ ”آرتی کا تعال لاؤ۔“

برجن۔ ”کون لے چلیگا۔ مہری کو بلا لو۔ (چونک کر) ارے! یہ تیرے ہاتھوں میں خون کہاں سے آیا۔“

مادھوی۔ ”او نہ پھول ختی تھی۔ کانٹے لگ گئے ہونگے۔“
چندرا۔ ”ابھی نئی ساڑی آئی ہے۔ آج ہی پھاڑ کے رکھ دی۔“

مادھوی ”تمہاری بلا سے“

مادھوی نے یہ کہہ کر دیا۔ مگر آنکھیں پُراپ ہو گئیں۔ چند ایوں بہت نیک عورت تھی۔ مگر جب سے بابو رادھا چرن نے قومی خدمت کے لئے نوکری سے استعفا دیا وہ بالاجی کے نام سے چڑھتی تھی۔ برجن سے تو کچھ کہ نہ سکتی۔ مادھوی کو چھڑتی ہوتی تھی۔ برجن نے چند راکھی طرف گھور کر مادھوی سے کہا ”جاؤ صندوق سے دوسری ساڑھی نکال لو۔ اسے رکھ آؤ۔ رام رام۔ مار کے ہاتھ چھلنی کر ڈالا“

مادھوی ”ویر ہو جائیگی۔ میں یوں ہی چلوں گی“

برجن ”نہیں ابھی گھنٹہ بھر سے زیادہ مہلت ہے“

یہ لکھ کر برجن نے پیار سے مادھوی کا ہاتھ دھویا۔ اُسکے بال گوندھے۔ ایک خوبصورت ساڑھی پہنائی۔ چادر اڑھائی۔ اور اُسے گلے سے لگا کر۔ پُراپ آنکھوں سے تاکتی ہوئی بولی ”بہن۔ دیکھو دھیرج ہاتھ سے زہائے“

مادھوی سسکا کر بولی ”تم میرے ہی ساتھ رہنا۔ مجھے سنبھالتی رہنا۔ مجھے اپنے دل پر آج بھروسہ نہیں ہے“

برجن سمجھ گئی کہ آج پریم نے مدہوشی کا درجہ اختیار کیا ہے۔ اور شاید یہی اُسکی انتہا ہے۔ آہ! یہ بادی بالو کی دیوار کھڑی کر رہی ہے۔

تھوڑی دیر میں مادھوی۔ برجن۔ سیوتی۔ چند راکھی عورتوں کے ساتھ سباما کے گھر کو چلیں۔ وہاں کی تیاریاں دیکھیں تو ڈنگ رہ گئیں۔ دروازہ پر ایک نہایت وسیع خمائی کھڑا تھا۔ فرش فردش اور شیشہ والات سے آراستہ۔ نو بہت بھر پور تھی۔ بڑے بڑے لوکروں میں میوے اور مٹھائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ شکر کے رس کا نامدار خوش وضع

لباس پہنے ہوئے استقبال کر نیکو کھڑے تھے فین اور گاڑیاں ایک بھی نظر نہ آتی تھیں۔ کیونکہ بالاجی ہمیشہ پیدل ہی چلا کرتے تھے۔ بہت سے لوگ گلی میں جھولیاں ڈالے ہوئے دکھائی دیتے تھے جنہیں شاید بالاجی نذر کر نیکی لئے روپے پیسے بھرے ہوئے تھے۔ راجہ دھرم سنگھ کے پانچوں لڑکے رنگین کپڑے پہنے زعفرانی صاف باندھے۔ ریشمی جھنڈیاں کمر میں کھونٹے بگل بجا رہے تھے۔ جوں ہی لوگوں کی نظر بجن پر پڑی ہزاروں سرفراطب سے خم ہو گئے۔ جب یہ خاتونیں اندر گئیں تو وہاں بھی آنگن اور سانبان اور کمرے دلہن کی طرح سجے ہوئے پائے۔ صدا عورتیں مہلبکباد گانے کے لئے بیٹھی ہوئی تھیں۔ بچوں کے ڈھیر جا بجا پڑے ہوئے تھے۔ سب مالک سفید ساڑی پہنے۔ صبر و علم کی تصویر بنی ہوئی دروازے پر کھڑی تھی۔ بجن اور مادھوی کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئی۔ بجن بولی۔ ”چچی آج اس گھر کے بھاگ جاگ گئے۔ سب سامنے رو کر کھڑا ہوا بدولت مجھے آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔“

غم نصیب ماں کے دل سے یہ دعا نکلی۔ ایک غم نصیب ماں کی بددعا نے راجہ دوسرے کو بیٹے کے فراق میں شربت مرگ چکھا یا تھا۔ کیا سبام کی یہ دعا بے اثر ہو گئی؟ دونوں ابھی اسی طرح باتیں کر رہی تھیں کہ گھنٹے اور ناقوسوں کی صدائیں آنے لگیں۔ شور مچا کہ بالاجی آپہنچے۔ عورتوں نے مبارکباد گانا شروع کیا۔ مادھوی نے

آرتی کا اٹھال لے لیا۔ اور استہ کی طرف ٹکملی باندھ کر دیکھنے لگی۔ ذرا دیر میں وردی پوش نوجوانوں کی ایک جماعت نظر آئی۔ اس کے بعد ارجن سبھا کے ایک سو بچیں ممبر گھوڑو پر سوار دکھائی دیئے۔ ان کے پیچھے بیٹھار آدمیوں کا ہجوم تھا۔ سارا شہر بھٹ پڑا تھا۔ شانے سے شانے چھل رہے تھے۔ سمندر کی ایک لہر تھی کہ بڑھتی چلی آتی تھی۔ اس ہجوم میں بالاجی کا چہرہ ایسا نظر آتا تھا جیسے بادل میں سے چاند نکلا ہو۔ بیٹائی پر سرخ چندن کا لگ تھا۔ اور گردن میں

گیر وے رنگ کی ایک چادر پٹی ہوئی تھی۔

سُباما دروازہ پر کھڑی تھی۔ جوں ہی بالاجی کا چہرہ اُسے نظر آیا ضبط ہاتھ سے جاتا رہا۔ دروازہ سے باہر نکل آئی۔ اور سر جھکائے۔ آنکھوں سے موتیاں پر دتی بالاجی کی طرف چلی۔ آج اُس نے اپنا کھویا ہوا لال پایا ہے۔ اور اُسے گلے لگانے کے لئے بیقرار ہو رہی ہے۔

سُباما کو اس طرح آنے دیکھ کر سب لوگ رُک گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے کوئی دیوی اُتر آئی ہے۔ جو طرہ سناٹا چھانگیا۔ بالاجی نے کسی قدم اُگے بڑھکر ماں کو پرنام کیا۔ اور اُس کے پیروں پر گر پڑے۔ سُباما نے اُنکا سراپنی گود میں لے لیا۔ اور اُنکے ماتھے پر کئی بوسے دیئے۔ آج اُس نے اپنا کھویا ہوا لال پایا ہے۔ اُس پر آنکھوں سے موتیاں برس رہی ہے۔

اس روح افزا نظارہ کو دیکھ کر لوگوں کے دل قومیت کے نشہ سے مدہوش ہو گئے۔ پچاس ہزار گلوں سے آواز اُٹنی بالاجی کی جے "بادل گر جا۔ اور چارو فطرت سے پھولوں کی برکھا ہونے لگی پھر اُسی طرح دوسری گھن گرج صدا بلند ہوئی "منفی سالکرام کی جے" اور ہزاروں آدمی جب وطن کے نشہ سے مست ہو کر دوڑے اور سُباما کے قدموں کی خاک پینٹانی پر ملنے لگے۔ ان غروں سے سُباما ایسی خوش ہو رہی تھی جیسے مہور کے سُٹنے سے ناگن متوالی ہو جاتی ہے۔ آج اُس نے اپنا کھویا ہوا لال پایا ہے۔ اس بے بہار رتن کے ملنے سے وہ رانی ہو گئی ہے۔ اسی رتن کے بدولت آج اُس کے قدموں کی خاک لوگوں کی آنکھوں کا سرمہ اور ماتھے کا چندن بن رہی ہے۔

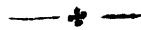
عجیب حیات بخش نظارہ تھا۔ بار بار جے جے کار کے نعرے بلند ہوتے تھے۔

اور عالم بالا کے بننے والوں کو بہارت کی بیداری کا مزہ دہناتے تھے۔ ماں اپنے بیٹے کو کلیے سے لگاتے ہوئے ہے۔ بہت دن کے بعد کج آئے اپنا کھوپا ہوالال پایا ہے۔ وہ لال جو اسکی خیم بھر کی کمائی تھی۔ پھول چارو نظرن سے نثار ہو رہے ہیں۔ زرعوں اور ہر کی بارش ہو رہی ہے۔ ماں مادرِ مٹیا کرتک پھولوں کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ایسا پڑا زمین کسکی آنکھوں نے دیکھا ہوگا!

سبباً مالاجی کا ہاتھ پکڑے ہوئے گھر کی طرف چلی۔ دروازہ پر پونچتے ہی عورتیں مبارکباد گانے لگیں۔ اور مادھوی سنہرے فقال میں دھوپ۔ دیپ۔ پھولوں سے آرتی اُتارنے لگی۔ برجمن نے پھولوں کی مالا انکے گلے میں ڈالی۔ وہ مالاجی سے مادھوی اپنے خون سے رنگا تھا۔ بالاجی نے چشم پُراب سے برجمن کی طرف دیکھ کر پُتام کیا۔ مادھوی کو بالاجی کے درشن کی کتنی آرزو تھی۔ مگر اسوقت اُسکی آنکھیں زمین کی طرف جھکی ہوئی ہیں۔ بالاجی کی طرف نہیں تاک سکتی۔ اُسے خوف ہے کہ میری آنکھیں دل کا بھیہ کھول دیں گی۔ اُنہیں پریم رس بھرا ہوا ہے۔ آج پہلی بار مادھوی کے دل میں نئی آرزو میں پیدا ہوئی ہیں۔ اب تک اُسکی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ بالاجی کا درشن پاؤں۔ مگر آج آرزوؤں نے سر اُٹھارا ہے۔ پوری ہونے کے لئے نہیں۔ آج باغِ حسرت میں ایک نئی کلی لگی ہے۔ کھلنے کے لئے نہیں۔ بلکہ مڑ جھانے کے لئے۔ اور مڑ جھاننا کہیں لمباتے کے لئے مادھوی کو کون سمجھائے کہ تو ان آرزوؤں کو دل میں نہ پیدا ہونے دے۔ یہ آرزوئیں تجھے بہت رُلا سکیں گی۔ تیری محبت خیالی ہے۔ تو اُسکے مزے سے واقف ہے۔ کیا اب واقعی محبت کا مزہ لیا جا سکتا ہے!

انتیسویں فصل

پریم کا سپنا



انسان کا دل آرزوؤں کا کائنات ہے۔ اور حسرتوں کی لہتی۔ کوئی زمانہ وہ تھا کہ مادھوی ماں کی گود میں کھیلتی تھی۔ اسوقت دل آرزوؤں اور حسرتوں سے خالی تھا مگر جب مٹی کے گھر وندے بنائے لگی۔ اسوقت دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ میں اپنی گڑیا کا بیاہ کروں۔ سب لڑکیاں اپنی گڑیا بیاہ رہی ہیں۔ کیا میری گڑیا کنواری رہے گی۔ میں اپنی گڑیا کو گھنے بنواؤں گی۔ کپڑے پہناؤں گی۔ اسکا بیاہ رہاؤں گی۔ اس آرزو نے اُسے مہینوں رُلایا۔ مگر گڑیا کی قسمت میں بیاہ نہ ہوا تھا۔ ایک روز بادل گھر آئے اور موسلا دھار پانی برسا۔ گھر وندا مینہ میں بہ گیا۔ اور گڑیے کے بیاہ کی حسرت رہ گئی۔

کچھ دن اور گزرے۔ ماں کے ساتھ برجن کے یہاں آنے جانے لگی۔ اُسکی میٹھی میٹھی باتیں سنتی اور خوش ہوتی۔ اُسکے بھال میں کھاتی۔ اور اُسکے گود میں سوئی۔ اسوقت بھی اُسکے دل میں ایک آرزو تھی کہ میرا خوب اچھا گھر ہوتا۔ اسیں چاندی کے کیوڑ لگے ہوتے۔ زمین ایسی صاف ہوتی کہ مٹی میٹھے اور بھسل جائے۔ میں برجن کو اپنے گھر لے جاتی۔ وہاں اچھی اچھی چیزیں بتاتی۔ اور کھلاتی۔ اور اچھے سے پینگ پر سلاتی۔ اور اُسکی خوب سدا کرتی۔ یہ آرزو برسوں تک دل میں چٹکیاں لیتی رہی۔ مگر اُسی گھر وندے کی طرح یہ گھر بھی ڈھس گیا۔ اور آرزوئیں مسبدل

بہسرت ہو گئیں۔

کچھ دن اور گزرے۔ بہار کے دن آئے۔ برجن نے اُسکے دل پر تپا چنپ کی تصویر کھینچ یعنی شروع کی۔ اندولوں اس ذکر کے سوا کوئی بات اچھی نہ لگتی۔ آخر تپا چنپ کی چھری بننے کی آرزو دل میں پیدا ہوئی۔ لیٹے لیٹے دل سے باتیں کیا کرتی ساتوں کو جاگ جاگ کر من کی منٹھائی کھاتی۔ ان خیالوں سے دل پر ایک نشہ سا ہو جاتا۔ مگر پرتاپ چندر اسی اثنا میں لاپتہ ہو گئے۔ اور اسی مٹی کے گھروندے کی طرح یہ ہوائی قلعے بھی ڈھس گئے۔ آرزوؤں کی جگہ دل میں حسرتیں رہ گئیں۔

اب حسرتوں کی اجھوم سے دل میں آرزوئی جگہ باقی نہ رہی۔ دیوتاؤں کی اُپاسا کرنے لگی۔ برت رکھنے لگی۔ تاکہ پرتاپ چندر پر زمانہ کی مٹی بھری نگاہ نہ پڑے پائے۔ اس طرح ایک مدت تک اُس نے تپسوی کی زندگی بسر کی۔ خیالی محبت کے نشہ میں چورہتی۔ مگر آج تپسوی کا برت ٹوٹ گیا۔ اور دل میں نئی آرزوؤں نے سر اٹھایا۔ دس سال کی تپسیا ایک لمحہ میں بھنگ ہو گئی۔ کیا یہ آرزوئیں بھی اُسی مٹی کے گھروندے کی طرح پامال ہو جائیں گی؟

آج جب سے مادھوی نے بالاجی کی آرتی اتاری ہے اُسکے آنسو نہیں تھے۔ سارا دن گزر گیا۔ اور ایک ایک کر کے تارے بجھنے لگے۔ سورج تھک کر چھپ گئے۔ اور چڑیاں تھک کر گھونسلوں میں آجھیں۔ مگر مادھوی کی آنکھیں نہیں ٹھکیں۔ وہ سوچتی ہے کہ ہاے! کیا میں اسی طرح روتے کے لئے بنائی گئی ہوں۔ میں کتنی ہی بھی تھی۔ کہ جسکے پہلے اتنا روتی ہوں۔ آہ۔ روتے روتے آدمی عمر گزر گئی۔ کیا یہ باقی دن بھی یونہی گئیں گے۔ کیا میری زندگی میں ایک دن بھی ایسا دیکھا جیسے یاد کر کے

حکیم ہو کر بیٹے بھی کبھی اچھے دن دیکھے تھے۔ آج کے پہلے مادھوی کبھی ایسی یاس زدہ اور شکستہ خاطر نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی طیالی محبت میں غمور تھی۔ آج اُسکے دل میں نئی آرزوئیں پیدا ہوئی ہیں۔ اور یہ آنسو اُنھیں کے کرتھے ہیں۔ جو دل سو لہ برسوں تک حسرتوں کا آرا مگا رہ چکا ہو وہی اسوقت مادھوی کے خیالات کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

سباما کے دل میں بھی آج نئی آرزوؤں نے سر اُبھارا تھا۔ جب تک بالاجی کو دیکھا نہ تھا۔ سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ایک نظر دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا کر لیتی۔ آج جب ایک نظر دیکھ لیا تو کچھ اور دیکھنے کی ہوس پیدا ہوئی مگر افسوس! مادھوی کے گھروں کی طرح خاک میں مل جانے کے لئے۔

آج سباما۔ برجن۔ اور بالاجی میں شام تک باتیں ہوتی رہیں۔ بالاجی نے لپنے تجربات بیان کئے۔ سباما نے اپنی رام کہانی سنائی۔ اور برجن نے کہا تھوڑا سنا بہت مفی سچوں الال کے سیاسی کی خبر کو کہ دونوں روئیں۔ جب چراغ جلنے کا وقت آ پہونچا تو بالاجی گنگا کی طرف سندھیا کرنے چلے گئے۔ اور سباما کھانا پکانے بیٹھی۔ آج کتنے دنوں کے بعد وہ من لگا کر کھانا پکا رہی ہے۔

دونوں باتیں کرنے لگیں۔

سباما بیٹھی۔ میری یہ دلی لالسا تھی کہ میرا لڑکا دنیا میں نیکیاں ہو۔ اور ایشور نے میری لالسا پوری کر دی۔ پرتاپ نے باپ کا۔ اور خاندان کا نام روشن کر دیا۔

آج جب سویرے میرے چچی کی بے متانی جا رہی تھی تو میرا دل اُٹ اُٹا تھا۔ میں مرنے اتنا چاہتی ہوں کہ وہ یہ دیر آگ تیاگ دیں۔ دلش کا اُپکار کرنے سے میں اُنھیں نہیں روکتی۔ بیٹے تو ہی جی سے یہی مردان مانگا تھا مگر اُنھیں سنایا میں

دیکھ کر یہ اکلچہ بچتا جاتا ہے۔“

برجن سباما کا مطلب سمجھ گئی۔ بولی نیچی یہ بات تو میرے دل میں پہلے ہی سے
جی ہوئی تھی۔ موقع پاتے ہی ضرور ذکر کروں گی۔“

سباما۔“ موقع شاید ہی ملے انکا کون ٹھکانا۔ اس وقت جی میں اُسے کہیں چلایا۔
سنتی ہوں سو تھاپا تھ میں لئے اکیلے جنگلوں میں گھومتے پھرتے ہیں مجھے
اب بیجاری مادھوی کی دشانیں دیکھی حاتی اُسے دیکھتی ہوں تو جیسے کوئی
میرے کلیسے کو کچلنے لگتا ہے۔ مینے بہت عورتیں دیکھیں۔ اور بہتوں کا حال
کتابوں میں پڑھا۔ مگر ایسا پریم کہیں نہیں دیکھا۔ بیجاری نے اُدھی عمر ورو
کر کاٹ دی۔ اور کبھی مُنہ سے شکایت کا ایک لفظ نہ نکالا۔ مینے کبھی اُسے روتے
نہیں دیکھا۔ مگر رونے والی آنکھیں۔ اور ہنسنے والے مُنہ چھپے نہیں رہتے۔
مجھے ایسی ہی بہو کی لالسا تھی۔ وہ بھی ایشور نے پوری کر دی۔ تم سے سچ کہتی ہوں
میں اُسے اپنی بہو ہی سمجھتی ہوں۔ آج سے نہیں برسوں سے۔“

برج رانی۔“ آج اُسے دن بھر روئے گذرا۔ بہت اُداس دکھائی دیتی ہے۔“
سباما۔“ تو آج ہی اسکا ذکر چھیڑو۔ ایسا منہ کل کسی طرف کی راہ لیں تو پھر ایک جگہ تک
انتظار کرنا پڑے۔“

برج رانی۔“ دغور کر کے؟“ ذکر کرنے کو تو میں کروں۔ مگر مادھوی۔ خود بھی خوبی سے
یہ کام کر سکتی ہے کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔“

سباما۔“ وہ بیجاری اپنی زبان سے کیا کہیگی؟“
برج رانی۔“ اُسکی آنکھیں آپ ساری رام کہانی کہہ نیگی۔“

سُبا ما۔ وہ اپنے دل میں کیا کیٹنگے۔“

برجن رانی نے کیٹنگے کیا یہ ہتھاری بھول ہے کہ تم مادھوی کو کنواری سمجھ رہی ہو۔
موت گزری کہ وہ پرتاپ چند کی دولہن بن چکی۔ ایشور کے یہاں اُسکا بیاہ اُنے

ہو چکا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا دنیا آدمیوں سے خالی تھی۔ مادھوی جیسی عورت کو
کون آنکھوں میں نہ بٹھائیگا۔ کیا اُسے اپنی آدھی جوانی مفت میں رو رو کر گنوائے
اُسے آج تک خیال میں بھی کسی غیر شخص کو بگڑہندی نہی۔ بارہ برسوں سے تیرہویں کی زندگی بسر کر رہی ہے وہ
پر نہیں سوئی۔ کوئی رنگین کپڑا نہیں پہنا۔ بال تک نہیں گوندھائے۔ کیا یہ سب باتیں
نہیں کہتیں کہ مادھوی کا بواہ اُنے ہو چکا۔ دلوں کا ملاپ سچا بیاہ ہے سیندھو
کا ٹیکہ اور گٹھ بندھن اور بھانوریں یہ سب دنیا کے ڈھکوسلے ہیں۔“

سُبا ما۔ اچھا جیسا مناسب سمجھو۔ کرو۔ میں صرف جگ ہنسائی سے ڈرتی ہوں۔“

رات کے نو بج گئے تھے۔ آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ مادھوی باغچہ میں
اکیلی بیٹھی ہوئی تاروں کو دیکھتی تھی اور دل میں سوچتی تھی کہ یہ دیکھنے میں کیسے

پچھلیے ہیں۔ مگر کتنے دور۔ کوئی وہاں تک پہنچ سکتا ہے۔ کیا میری امیدیں
بھی انھیں تاروں کی طرح ہیں۔ اتنے میں برجن نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر بلایا۔ مادھوی
چونک پڑی۔

برجن۔ اندھیرے میں بیٹھی یہاں کیا کر رہی ہے؟

مادھوی۔ کچھ نہیں۔ تاروں کو دیکھ رہی ہوں۔ وہ کیسے خوشنما ہیں۔ مگر مل نہیں سکتے۔“

برجن کے کلبہ میں چھپی سی لگ گئی۔ ضبط کر کے بولی تمہارے گننے کا یہ وقت

نہیں ہے۔ جس مہمان کے لئے آج سویرے تک بھولی نہیں ساتی تھی۔ کیا ابھی

اُسکی مہانداری کرو گی“

مادھویؒ میں ایسے مہمان کی مہانداری کرنے کے قابل کب ہوں“
برجنؒ اچھا یہاں سے اُٹھو تو۔ میں مہانداری کا ڈھنگ بتاؤ گی“

یہ لکھ کر برجن نے مادھوی کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھا دیا۔ دونوں اندر آئیں۔ سببا لکھانا
پکا چکی تھی۔ بالاجی کو ماں کا بنایا ہوا کھانا آج مدتوں کے بعد ملا۔ بڑی رغبت سے کھلایا۔
سببا لکھاتی جاتی تھی۔ اور روتی جاتی تھی۔ جب بالاجی کھاپی کر لیٹے تو برجن نے مادھوی
سے کہا۔ اب یہاں کوٹنے میں مُنہ ڈھاپ کر کیا بیٹھی ہو؟“

مادھویؒ کچھ دیدہ دیکھا کے سو رہی ہیں۔ اب یہی جی چاہتا ہے“

برجنؒ مادھوی ایسی نراس نہو کیا اتنے دنوں کا برت ایک دن میں بھنگ کر دی گی“

مادھوی اُٹھی مگر دل مٹھا جاتا تھا۔ جیسے بادلوں کی کالی کالی گھٹائیں اُٹھتی ہیں
اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب جل تھل ایک ہو جائیگا۔ مگر کیا ایک پھپھو ہوا چلنے لگتی ہے۔
اور سارے بادل کافی کی طرح بھٹ جاتے ہیں۔ اُسی طرح اسوقت مادھوی کے دل
کی کیفیت ہو رہی تھی۔

یہ مبارک دن دیکھنے کی آرزو اسکے دل میں کتنے دنوں سے تھی۔ کبھی وہ دن

آئیگا کہ میں اُنکے درشن پاؤں گی اور اُنکی امرت کی سی باتیں سنوں گی۔ اس دن کے لئے
اُس نے کیسی کیسی منتیں مانی تھیں۔ اس دن کے خیال ہی سے اُس کا دل کیسا کھل اُٹھا تھا۔

آج صبح مادھوی بہت خوش تھی۔ اُس نے بڑے شوق سے پھولوں کا ہار گونڈھا

تھا۔ سیکڑوں کانٹے ہاتھ میں چبھائے۔ متوالوں کی طرح گر گر پڑتی تھی۔ یہ سب

خوشی اور نشہ اسی لئے تو تھا کہ آج وہ مبارک دن آگیا۔ آج وہ دن آگیا جب کی طرف
ایک مدت دراز سے آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ زمانہ بھی اب یاد نہیں جب یہ آرزو
دل میں نہ رہی ہو۔ مگر اس وقت مادھوی کے دل کی وہ کیفیت نہیں۔ خوشی کی بھی انتہا
ہوتی ہے۔ غالباً وہ مادھوی کے خوشی کی انتہا تھی جب وہ باغچے میں جھوم جھوم کر
پھولوں سے آپھل بھری رہی تھی۔ جسے کبھی خوشی کا مزہ ہی نہ چکھا ہو اسکے لئے اتنی ہی
خوشی معراج کا مانی ہے۔ وہ غریب اس سے زیادہ خوشی کا بوجھ نہیں سنبھال سکتی۔
جن ہونٹوں پر کبھی ہنسی ہی نہیں آئی اُنکا مسکرانا ہی ہنسی ہے۔ تم ایسوں سے زیادہ
ہنسنے کی امید کیوں رکھتے ہو۔ مادھوی بالاجی کی طرف سے علی۔ مگر اس طرح نہیں جیسے ایک
نئی نویلی ہو۔ ارمائوں سے بھری ہوئی۔ سنگار کئے اپنے پتی کے پاس جاتی ہے۔
یہی کمرہ تھا جسے وہ اپنے دیوتا کا مندر سمجھتی تھی۔ جب مندر خالی تھا تب وہ آکر اس میں
آنسوؤں کے پھول چڑھاتی تھی۔ آج جب دیوتا نے اس کی بات تو وہ کیوں دیول
بجل بجل کر رہی ہے۔

رات خوب بھیگ چکی تھی۔ رطک پر سے ٹریوے کے گھنٹوں کی آوازیں کان
میں آرہی تھیں۔ مادھوی دبے پاؤں بالاجی کے کمرہ کے دروازہ تک گئی۔ اُسکا دل
دھڑک رہا تھا۔ اندر جانے کی ہمت نہ پڑی۔ کسی نے پیرتھام لئے اُسکے قدم لوٹ
آئی۔ اور دین پر بٹھکر رونے لگی۔ اُسکے دل نے کہا مادھوی! یہ بڑے شرم کی بات
ہے۔ تو بالاجی کی جیری سہی۔ مانا کہ تجھے اُن سے پریم ہے۔ مگر تو انکی دامن نہیں ہے۔
تجھے اس وقت اُسکے کمرہ میں قدم رکھنا ہرگز مناسب نہیں۔ تیرا پریم تجھے انکی ہمتی نہیں دے سکتا
پریم اور تجیز ہے۔ سماگ اور تجیز پریم دل کا بھکاؤ ہے۔ بیاہ ایک پاک فرض ہے۔ تب مادھوی

ایک بیاد آیا۔ دوسرے نے بھری سبھائیں دولہن کی بانہ پکڑی تھی۔ اور کہا تھا کہ اس استری کو میں اپنے گھر کی مالکہ اور اپنے دل کی دیوی سمجھتا رہو گا۔ اس سبھاکے لوگ۔ اور آکاش۔ اور آگنی اور دیوتا اسکے گواہ رہیں۔ آہ! کیسے مبارک الفاظ ہیں۔ مجھے بھی کبھی یہ الفاظ سننے نصیب ہوئے تھے۔ میں نہ آگن کو اپنا ساکشی بنا سکتی ہوں۔ نہ دیوتاؤں کو۔ نہ آکاش کو۔ مگر اے آگنی۔ اے آکاش کے تارو۔ اے دیولوک کے بایو۔ تم شاہد رہنا کہ مادھوی نے بالاجی کی پاک صورت کو دل میں جگہ دی۔ مگر کسی ناپاک خیال کو دل میں نہ آنے دیا۔ اگر میں نے کمرہ کے اندر قدم رکھا ہو تو اے آگنی تم اس وقت مجھے جلا کر رکھ کر دو۔ اے آکاش۔ اگر تو نے اپنی ہزار آنکھوں سے بھی مجھے کمرہ میں جاتے دیکھا ہو تو اسیرم مجھ پر اندر کا بھر گرا دے۔

مادھوی کچھ دیر تک انھیں خیالات میں ڈوبی بیٹھی رہی۔ یکایک اُسکے کان میں بھک بھک! کی آواز آئی۔ اسنے چونک کر دیکھا تو بالاجی کا کمرہ بہت زیادہ روشن ہو گیا تھا۔ اور کھڑکیوں سے روشنی باہر نکل کر صحن میں پھیل رہی تھی۔ مادھوی کے پیر تلے سے مٹی نکل گئی۔ معانیال گذار کر ریز کالمپ بھبک اُٹھا۔ ہوا کی طرح وہ بالاجی کے کمرہ میں گھسی۔ دیکھا تو لیمپ زمین پر پھٹ کر گر پڑا ہے۔ اور فرش میں تیل کے پھیل جانے سے آگ لگ گئی ہے۔ دوسرے کنارے پر بالاجی آرام سے سو رہے تھے۔ ابھی تک اُنکی نیند نہ گھلی تھی۔ انھوں نے قالین سمیٹ کر ایک کونے میں رکھ دیا تھا بجلی کی طرح لپک کر مادھوی نے یہ قالین اٹھالیا۔ اور اُسے شعلوں کے اوپر گرا دیا۔ دھماکے کی آواز ہوئی تو بالاجی نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ کمرہ میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ اور چاروں طرف تیل کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ واقعہ کی صورت سمجھنے بولے۔ بڑی

خیریت ہوئی۔ ورنہ کمرہ میں آگ لگ گئی تھی۔“

ما دھوی ”جی ہاں ذرا لیپ گر پڑا تھا۔“

بالاجی ”تم بڑے موقع سے آ پہنچیں۔ کیسے معلوم ہوا تمہیں؟“

ما دھوی ”میں یہیں یا ہر ٹیھی ہوئی تھی۔“

بالاجی ”تکو بڑی تکلیف ہوئی۔ اب جا کر سوؤ۔ رات زیادہ آگئی ہے۔“

ما دھوی ”چلی جاؤنگی۔ سونا تو روز ہے۔ یہ موقع نہ جانے پھر کب آئے۔“

ما دھوی کی آواز میں غضب کا درد تھا۔ بالاجی نے اُسکی طرف غور سے دیکھا۔

اٹھارہ سال پہلے انہوں نے ما دھوی کو دیکھا تھا۔ اسوقت وہ ایک کھلتی ہوئی

کلی تھی۔ اور آج ایک مرجھایا ہوا پھول۔ نہ چہرہ پر تازگی۔ نہ آنکھوں میں خوشی۔

نہ مانگ میں سہاگ کا ڈورا تھا۔ نہ ماتھے پر سیندور کا ٹیکہ۔ جسم پر زیور و نگار نشان

بھی نہ تھا۔ بالاجی نے قیافہ سے سمجھا کہ بدھاتانے عین شباب میں اس دکھایا کا

سہاگ ہر لیا ہے۔ بہت مغموم ہو کر بولے۔ ”کیوں ما دھوی۔ تمہارا بیاہ تو ہو گیا ہے نہ؟“

ما دھوی کے کلیجہ میں چھری اتر گئی۔ ابدیدہ ہو کر بولی۔ ”جی ہاں ہو گیا ہے۔“

بالاجی ”اور تمہارا پتی؟“

ما دھوی ”انہیں میری کچھ سُدھی نہیں۔ آگیا بیاہ مجھے نہیں ہوا۔“

بالاجی متحیر ہو کر بولے۔ ”تمہارا پتی کتنا کیا ہے؟“

ما دھوی ”دلش کی سیرا۔“

بالاجی کے آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ ما دھوی کا مطلب

سمجھ گئے۔ پوچھا۔

”مادھوسی! اس بیاہ کو کتنے دن ہوئے؟“

”مادھوسی“ مجھے کچھ یاد نہیں۔ بہت دن ہوئے۔ شاید اٹھارہ بیس سال۔
 بالاجی کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ اور چہرہ پر قومی غرور کا لٹہ سا چھا گیا۔ بھارت
 ماتا! آج اس گئے گزرے زمانہ میں بھی تمہاری گود میں ایسی ایسی دیویاں کھیل رہی
 ہیں جو ایک خیال پر اپنی جوانی۔ اور زندگی کی آرزو میں قربان کر سکتی ہیں۔ بولے
 ”ایسے بچے کو تم تیاگ کیوں نہیں دیتیں؟“

مادھوسی نے بالاجی کی طرف پُر غرور نگاہوں سے دیکھا اور بولی ”سوا“

آپ اپنی زبان سے ایسا نہ فرمائیں۔ میں ہندو عورت ہوں۔ میں نے گاندھارہ
 ساوتری کے کل میں جنم لیا ہے۔ جسے ایک بار دل سے اپنا بیتی مان چکی اُسے
 سکتی۔ اگر میری زندگی یونہی روتے روتے کٹ جائے تو بھی اپنے بیتی کی طرف
 مجھے مطلق ملال نہوگا۔ جب تک میرے تن میں جان رہیگی میں ایشور سے اٹکی بھلائی
 چاہتی رہوں گی۔ میرے لئے یہی کیا کم ہے کہ ایسے مہاتما کے پریم نے میرے دل میں
 باس کیا۔ میں اسی کو اپنا سوجھا گیا سمجھتی ہوں۔ آج اٹھارہ سال سے زیادہ ہوا کہ میں نے
 بناؤ سنگار کا خیال تک دل میں نہیں آنے دیا۔ میں نے ایک بار اپنے سوامی کو دوسرے
 دیکھا تھا۔ اور وہ تصویر ایک دم کے لئے بھی میری نگاہوں سے نہیں اُترتی۔ جب کبھی
 میں بیمار ہوتی ہوں اُسی تصویر نے میری تیار داری کی ہے۔ جب کبھی میں بیوگ کے
 دھمکے سے بچھین ہو کر آنسو بہاؤں میں اُسی تصویر نے مجھے ڈھارس دیا ہے۔ اُس
 بچہ کو میں کیسے تیاگ دوں۔ میں اُسکی ہوں اور ہمیشہ اُسکی ہوں گی۔ میرا دل اور میری
 جان اُسکے نذر ہو چکے۔ اگر وہ کہے تو آج میں آگ کے گود میں ایسی خوشی سے

جا بیٹھوں گویا پھولوں کا سیج ہے۔ اگر میری جان اُسکے کسی کام آئے تو میں ایسی خوشی سے دید ونگی جیسے کوئی اُپاسک دیوتا پر پھول چڑھا دیتا ہے۔“

ما دھوی کا چہرہ جوش سے گلگلوں ہو رہا تھا۔ بالاجی نے اُسکی باتیں نہیں اور دم بخود ہو گئے۔ یہ وہ عورت ہے جسے صرف میرے خیال پر اپنی زندگی قربان کر چکی۔ اس خیال سے بالاجی کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ جس پریم نے ایک عورت کی گلی جلا کر خاک کر دی ہو اُسکے لئے ایک آدمی کے استقلال کو جلا ڈالنا کوئی بڑی

نہیں۔ پریم کے مقابلہ میں ضبط کوئی چیز نہیں ہے۔ بولے۔ ”ما دھوی! تم جیسی بھارت کے لئے سرمایہ نازی ہیں۔ میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ تمہارے پریم، منول چیز یوں میرے ہاتھ آ رہی ہے۔ اگر تم نے میرے لئے جو گنی بنا پسند کیا ہے دین بھی تمہارے لئے اس سنیاس اور ویراگ کو خیر باد کہہ سکتا ہوں جسکے لئے تم نے اپنے تئیں مٹا دیا ہے۔ وہ تمہارے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے بھی نہ ہچکچکا۔“

ما دھوی نے فوراً جواب دیا۔ وہ اس جواب کے لئے پہلے ہی سے تیار تھی۔

سوامی جی! میں بہت کمزور اور بے عقل عورت ہوں۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ذاتی آرام کا خیال آج تک ایک لمحہ کے لئے بھی میرے دل میں نہیں آیا۔ اگر آپ نے یہ خیال کیا کہ میرے پریم کا معراج صرف یہ ہے کہ آپ کے پیروں میں سنسار کے بندھنوں کی بیڑیاں ڈال دوں تو (ہاتھ جوڑ کر) آپ نے اسکی حقیقت بالکل غلط سمجھی۔ میرے پریم کا معراج وہی تھا جو آج مجھے حاصل ہو گیا۔ آج کا دن میری زندگی کا سب سے مبارک دن ہے۔ آج میں اپنے پرانے ہاتھ کے سامنے کھڑی ہوں۔ اور اپنے کانوں سے اُنکی امرت منی باتیں سن رہی ہوں۔ سوامی جی! مجھے اُمید نہ تھی کہ

اس زندگی میں مجھے یہ دن دیکھنا نصیب ہو گا۔ اگر میرے پاس دنیا کا راج ہوتا تو میں اس خوشی میں اُسے آپ کے قدموں پر تیار کر دیتی۔ میں ہاتھ جوڑ کر آپ سے منت کرتی ہوں کہ مجھے اب پرلوں سے الگ نہ کیجیگا۔ میں سلیاس لے لوں گی اور آپ کے ساتھ رہ لوں گی۔ میں دیر آگن بنوں گی۔ بھوت رماؤں گی۔ مگر آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گی۔ پران نا تھا! میں نے بہت دکھ سہے ہیں۔ مگر اب یہ جلن نہیں رہی جاتی۔

یہ کہتے کہتے مادھوی کا گلہ دندھ گیا۔ اور آنکھوں سے پریم کی دھارا بہنے لگی۔ اُس سے وہاں نہ بیٹھا گیا۔ اُٹھ کر پتہ نام کیا۔ اور برجن کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ برجن رانی نے اُسے گلے لگالیا اور پوچھا کیا بات چیت ہوئی؟

مادھوی: ”جو تم جاہتی تھیں“

برجن رانی: ”سچ! کیا یوے؟“

مادھوی: ”یہ نہ بتلاؤں گی“

برجن رانی کو گویا پیڑی دولت مل گئی۔ بولی: ”ایشور نے بہت دنوں میں میرا حوصلہ پور کیا۔ میں اپنے یہاں سے بیاہ کروں گی“۔ مادھوی مایوسانہ انداز سے مسکراتی برجن نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: ”ہلکو بھول تو نہ جائیگی۔ اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے“

پھر آواز سنبھال کر بولی: ”تو ہم سے اب بچھڑ جائیگی“

مادھوی: ”میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی“

برجن: ”جل باتیں نہ بنا“

مادھوی: ”دیکھ لینا“

برجن: ”دیکھا ہے۔ جوڑا کیسا پہنسیگی“

ماوصویٰؑ سفید جیسے بگلے کا پرؑ
 برجنؑ سہاگ کا جوڑا کیسریئے رنگ کا ہوتا ہےؑ
 ماوصویٰؑ میرا اُجلار ہوگاؑ

برجنؑ تجھے چند رہا بہت پسند تھا۔ میں اپنا دید و نگاہیؑ
 ماوصویٰؑ دمسکر کر ہمار کی جگہ کنٹھی دیدیناؑ

برجنؑ کیسی باتیں کر رہی ہے؟ؑ

ماوصویٰؑ اپنے سنگھار کیؑ

برجنؑ تیری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ تو اس وقت اتنی اُداس کیوں ہے۔ تو سنؑ

اس رتن کے لئے کیسی کیسی تپسیا کی۔ کیا کیا جوگ سادھا۔ کیسے کیسے برت

رکھے۔ اور آج تجھے جب وہ رتن مل گیا تو تو خوش نہیں دکھائی دیتیؑ

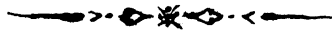
ماوصویٰؑ تم بیاہ کی بات چیت کرتی ہو۔ اس سے مجھے حدمہ ہوتا ہےؑ

برجنؑ یہی تو خوش ہونے کی بات ہےؑ

ماوصویٰؑ بہن میرے بھاگ میں وہ خوشی لکھی ہی نہیں۔ جو چڑیا بادلوں میں

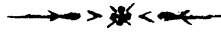
گھومنا لانا پاہتی ہے۔ وہ سدا ڈالیوں پر رہیگی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ

زندگی کے یہ چند سال اسی طرح پریم کا سہنا دیکھنے میں کاٹ دوںؑ



تیسویں فصل

الوداع



دوسرے دن بالاجی اسنان دھیان سے فارغ ہو کر راجہ دھرم سنگھ کا انتظار کرنے لگے۔ آج راج گھاٹ پر ایک عظیم الشان گونڈال کی بنیاد پڑینوالی تھی۔ شہر کے کوچہ و بازار مسکراتے نظر آتے تھے۔ سڑک پر دورویہ پرقین اور جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ سڑکیں ہنسا دھو کر اپنا سینہ فرش راہ کئے ہوئے تھیں۔ دروازے پھولوں کی مالا گلے میں ڈالے غیر مقدم کرنے کے لئے تیار تھے۔ کیونکہ آج اُس حبیب وطن کی آمد ہے جسے اپنا سب کچھ ملک پر قربان کر دیا ہے۔

خوشی کی دیوبی اپنے سکیوں سیلیوں کے ساتھ محو خرام تھی۔ ہوا مستی سے جھومتی پھرتی تھی۔ ریخ و غم کا کیں نشان نہ تھا۔ جا بجا فوبت چھڑا رہی تھی۔ مرد خوش وضع لباس زیب تن کئے اٹھلاتے تھے۔ عورتیں سو اہوں سنگار کئے منگل گیت گاتی تھیں لڑکے زعفرانی صافے ہاندھے کلیلیں کرتے تھے۔ ہر مرد و زن کے چہرہ سے خوشی جھلک رہی تھی۔ کیونکہ آج قوم کے ایک بچے جاں نثار کی آمد ہے جسے اپنا سب کچھ قوم کے نظر کر دیا ہے۔

بالاجی جب اپنے ہاں شاعر فیقوں کے ساتھ راج گھاٹ کی طرف چلے تو مسوچ نے گوشہ مشرق سے نکل کر اسکا استقبال کیا۔ اُنکا مردانہ چہرہ جوں ہی لوگوں نے دیکھا

ہزاروں زبانوں سے ”بھارت کی ہے“ کا پُر خروش نعرہ نکلا۔ اور نضائے آسمان کو چیرتا ہوا گنبد گردوں تک جا پہنچا۔ گھنٹے اور ناقوس کی صدا میں بلند ہوئیں۔ اور مسرت کے دلاویز نغمے ہوا میں گونجنے لگے۔ جس طرح غم کو دیکھتے ہی پروانے اُسپر نثار ہونے کو لوٹ پڑتے ہیں۔ اُسی طرح بالاجی کو دیکھ کر لوگ بڑی تیزی سے نکلے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ ارجن سبھا کے سوا سوسمبھوں نے باقاعدہ سلام کیا۔ انکی خوشنما ویاں۔ اور سبکدھام گھوڑے نظروں میں کبھے جاتے تھے اس بھارت کا ایک ایک مہر قوم کا سچا ہاں نثار تھا۔ اور اُنکے پُر جوش نعرے لوگوں کے دلوں کو حوصلے لبریز کئے دیتے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ نویتیں چھڑ رہی تھیں۔ پھول اور میوے برس رہے تھے۔ جا بجا شہر کی لائٹیں سنگار کئے۔ سُنہرے تھالوں میں کافور پھول اور صندل لئے آرتی آتارتی جاتی تھیں۔ دوکانیں عروس زیبائی کی طرح آراستہ تھیں۔ سارا شہر رشک چمن بنا ہوا تھا۔ اور جہ طرح سادوں کے مہینہ میں کالی کالی گھٹائیں اُٹھتی ہیں۔ اور رہ رہ کر حد کی گھن گرج صدا دلوں کو ہلا دیتی ہے۔ اُسی طرح اس خلقت بے پایاں کی زبانوں سے ”بھارت کی ہے“ کی حوصلہ نواز آوازیں دلوں میں ولولہ اور گرمی پیدا کر رہی تھیں۔ جب بالاجی چوک میں پہنچے تو ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ پانچو نو عمر لڑکے اودے رنگ کے لیس دار کوٹ پہنے زعفرانی رنگ کے پیچہار صافے باندھے۔ اور ہاتھوں میں خوبصورت سونے لئے سہراہ مکڑے تھے۔ بالاجی کو دیکھتے ہی وہ دس دس کی قطاروں میں ہو گئے۔ اور اپنے دندے بچا بچا کر یہ پُراثر گیت گانے لگے۔

بالاجی تیرا آنا مبارک ہوئے

دھن دھن بھاگ ہیں اس نگری کے + دھن دھن بھاگ ہمارے
 دھن دھن اس نگری کے باسی بہ جہاں تیرے چرن پدھارے
 بالاجی تیرا انا مبارک ہوئے

کیسا نظارہ دلکش تھا۔ نغمہ اگرچہ سادہ تھا۔ مگر متعده اور موزوں آوازوں نے
 ملکر اسے ہلاکا دلکش اور پُر اثر بنا دیا تھا۔ لوگوں کے قدم دیں جم گئے۔ اور چوڑی سناٹا بھا
 گیا۔ غموخی میں یہ ترازو ایسا ہی سہانا معلوم ہوتا تھا جیسے رات کے ستارے میں
 نغمہ عندلیب۔ سارا عالم نقش حیرت بنا کھڑا تھا۔ غریب بھارت باسیوں نے اسے
 نظارے کہاں دیکھے۔ اس وقت خوب سیر ہو کر دیکھ لو۔ تم قاصدان و لنواز کی نغمہ سرائی
 سے آسودہ ہو گئے۔ حسنین کی نازک ادائیاں بہت دیکھ چکے۔ گل و گلشن کی بہت سیکیا
 کیں مگر وہ مسرت علوی۔ وہ حوصلہ طرب نیز جو اس وقت تم محسوس کر رہے ہو تھیں کبھی
 اور بھی حاصل ہوا تھا۔ رقصان و لنواز کے نغمے اور حسنین کی نازک ادائیاں اور گل و
 گلشن کی سیریں تمہارے نفس کو خوش کرتی ہیں۔ مگر تمہارے حوصلوں کو پست اور
 کمزور بنا دیتی ہیں۔ لیکن ایسے نظارے تم میں قومیت اور قومی جوش اور قومی ہمدردی
 کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ اگر تم نے اپنی زندگی میں ایک بار بھی یہ نظارہ دیکھا ہے تو
 اسکا پاک نقش تمہارے دلیں سے کبھی نہ ٹپکے گا۔

بالاجی کا دجیہ چہرہ روحانی مسرت کے روشنی سے منور ہو رہا تھا۔ اور آنکھوں سے
 پتے قومی غور کی شمعیں نکل رہی تھیں جس طرح کسان اپنے اہلہاتے ہوئے کھیت کو
 دیکھ کر خوشی کے نشہ سے متوالا ہو جاتا ہے۔ وہی کیفیت اس وقت بالاجی کی تھی۔ جب
 نغمہ بند ہو گیا تو آنکھوں نے چند قدم آگے بڑھ کر دیکھو بڑے بچوں کو اٹھا کر اپنے کندھوں پر

بٹھالیا۔ اور ایک عالم سستی میں زور سے نعرہ لگایا ”بھارت ماتا کی جے“
 اسطرح خراما خراما لوگ راج گھاٹ پر پہنچے۔ یہاں گوشال کی ایک شاندار۔
 سر بفلک عمارت استقبال کے لئے کھڑی تھی۔ صحن میں محلی فرش بچھا ہوا تھا۔ محرابیں۔
 ستون اور دروازے خوشنما پھولوں اور پتیوں سے سجے ہوئے تھے۔ مکان کے اندر
 کئی ہزار گائیں بندھی ہوئی تھیں۔ بالاجی نے اپنے ہاتھوں سے لہکنے ناندوں میں
 کھلی اور بھوسہ ڈالا۔ انھیں پیار سے تھپکیاں دیں۔ ایک وسیع کمرہ میں سنگ مرمر کا شمن
 حوض بنا ہوا تھا۔ دو دروازے لبریز۔ بالاجی نے ایک چلو دودھ لیکر آنکھوں سے لگایا۔
 ادب پی گئے۔ اسکے بعد ہزاروں آدمی اس چشمہ آب حیات سے فیضیاب ہوئے۔

ابھی صحن میں لوگ اطمینان سے بیٹھے بھی نہ پائے تھے کہ کئی آدمی بدحواس
 دوڑتے ہوئے آئے اور کہا کہ ہنڈت بدلو شاستری۔ سیٹھ اُتم چند اور لالہ مکھن لال
 باہر کھڑے غل چارہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ بکو بالاجی سے دو دیباہیں کر لینے دو۔ بدلو
 شاستری بنارس کے نامی گرامی پنڈت تھے۔ خوبصورت ہلالی نیک لگاتے۔ سبز بانات
 کی مرزائی پہنتے اور سبٹی پگڑی باندھتے تھے۔ اُتم چند اور مکھن لال دونوں شہر کے
 رئیس اعظم لکھنؤ آدمی تھے۔ خطاب کے لئے ہزاروں لاکھوں طرح کرتے۔ اور اعلیٰ
 عمدہ داروں کی تواضع و تکریم و خاطر مدارات کو فرض ادبی سمجھتے تھے۔ ان حضرات کا
 شہر کے آدمیوں پر بڑا دباؤ تھا۔ بدلو شاستری جب کبھی شاستر اڑھتے کرتے تو یہ یقینی بات
 تھی کہ فریق ثانی کی خیریت نہیں خصوصاً بنارس کے پنڈے اور پراگوال اور اسی
 قبیل کے دوسرے مفت خور تو انکے پسینہ کی جگہ خون بہانے کو تیار رہتے تھے۔
 شاستری جی بنارس میں سنا تن و حرم کے وکیل اور رکن اعظم مشہور تھے اُتم چند

اور مکھن لال بھی مذہبی جوش و خروش سے لبریز تھے۔ اس وقت انکی تشریف آوری
 فتنہ انگیزی سے خالی نہ تھی۔ سنا تن و صرم کا فرض اولیں تمدن کے نقائص کی حمایت
 کرنا ہے۔ اور چونکہ بالاجی اصلاح کے پُر زور حامی تھے۔ اسلئے انکی مخالفت کرنا
 اور انھیں زک دینا سنا تن و صرم کے اراکین کا فرض مذہبی تھا۔ بالاجی کی روز
 افزوں کامیابیوں کو دیکھ دیکھ اُنکے کیلجے پر سانپ لوتتا رہتا تھا۔ اور یہ لوگ عرصے
 بالاجی کے ساتھ شاستر اٹھتے رہے۔ یا بر الفاظ دیگر۔ فوجداری کرنے کا موقع ڈھونڈ
 رہے تھے۔ آج انکی دلی مُرادیں برائیں۔ پنڈوں اور پراگوالوں کی ایک جمعیت کثیر لیکر
 آپہونے۔

بالاجی نے ان مہاتماؤں کے آنے کی خبر سنی تو باہر نکل آئے۔ مگر یہاں کی کیفیت
 دیکھی تو ہوش اُٹ گئے۔ طرفین کے لوگ لاٹھیاں سنبھالے۔ آستین چڑھائے گھٹنے کو
 تیار کھڑے تھے۔ شاستری جی پراگوالوں کو وار کرنے کے لئے لٹکار رہے تھے۔ اور
 سیٹھ جی باواز بلند فرما رہے تھے کہ ان شور وروں کی دھجیاں اُڑا دو۔ ہم عدالتیں
 دیکھ لیں گے۔ ہمارا بال بیکا نہوئے پانیکا۔ مکھن لال صاحب بھی گلے پھاڑ پھاڑ کر
 فرماتے تھے کہ نخل آسے بے ہوتا ہو۔ ایک ایک کو سبز باغ دکھا دو سکا۔ بالاجی نے
 جب یہ رنگ دیکھا تو راجہ و صرم سنگھ سے بولے آپ بدلو شاستری کو جا کر سمجھا دیجئے کہ
 اس شر و فساد سے باز آئیں۔ ورنہ طرفین کا نقصان ہوگا۔ اور جگ ہنسائی ہوگی وہ
 الگ۔ راجہ صاحب کی آنکھوں سے آنکھارے برس رہے تھے۔ بولے اس شخص سے
 بات کرنا میں اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ اُسے پراگوالوں کی جمعیت پر غرہ ہے۔ مگر میں آج
 انکی ساری شیخی کر کر رہی کئے دیتا ہوں۔ انکا فتنا بجز اسکے اور کچھ نہیں کہ آپ پروردگیاں

مگر جب تک میں اور میرے پانچوں بیٹے زندہ ہیں کوئی آپ کی طرف آنکھ نہیں اٹھا سکتا۔
بس آپ کے ایک اشارہ کی دیر ہے۔ اور میں دم کی دم میں انھیں اس شرارت کا مزہ
چکھا دوں گا۔

بالاجی سمجھ گئے کہ یہ شیر بچہ کیا ہے۔ اس سے مصالحت کی اُمید رکھنی فضول ہے۔
راجپوت جب بچہ رہا ہے تو اُسے مرنے مارنے کے سوا کچھ اور کوئی خیال نہیں رہتا۔ بولے
”راجہ صاحب! آپ دورانِ دلش ہو کر ایسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ موقع ایسی باتوں کا نہیں
ہے۔ آگے بڑھ کر اپنے آدمیوں کو روکنے۔ ورنہ نتیجہ بہت بُرا ہو جائیگا۔“

بالاجی یہ کہتے کہتے یکایک رُک گئے۔ سمندر کی لہروں کی طرح لوگ ادھر ادھر سے
اُڑتے چلے آتے تھے۔ ہاتھوں میں لالٹیاں تھیں۔ اور آنکھوں میں خون کی شرخی۔
چہرے غضبناک۔ تیروں پر پل پڑے ہوئے۔ دیکھتے دیکھتے یہ جماعت کثیر پرالوں
کے سر پر پہنچ گئی۔ اور قریب تھا کہ لالٹیاں سروں کا بوسہ لیں اور سنگین کلجوں میں چھپیں
کہ بالاجی بجلی کی طرح کوند کر ایک گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ اور نہایت پُر زور لہجہ میں فرمایا۔
”بھائیو! یہ کیا اندھیر ہے۔ اگر مجھے اپنا دوست سمجھتے ہو تو فوراً ہاتھ نیچے کر لو۔ اور

بیروں کو ایک لہجہ آگے مت بڑھتے دو۔ مجھے غصہ کہ تمہارے دلوں میں مردانہ غصہ اور جوش موجزن ہو رہا ہے۔
مردانہ غصہ ایک پاک جذبہ اور مقدس جوش ہے۔ مگر مردانہ ضبط اُس سے بھی زیادہ پاک اور مقدس
فرض ہے۔ اسوقت اپنے غصہ کو ضبط سے روکو۔ کیا تم اپنے قوم کے ساتھ کلِ فرائض
ادا کر چکے کہ یوں جان دینے پر آمادہ ہو کر کیا تم مشعل لیکر بھی کنوئیں میں گرنا چاہتے ہو۔

یہ لوگ تمہارے ہموطن۔ تمہارے بھائی۔ تمہارے ہی خون ہیں۔ انھیں اپنا دشمن
مت سمجھو۔ اگر وہ جاہل ہیں تو انکی جہالت کو دور کرنا تمہارا فرض ہے۔ اگر وہ تھیں گالی

مگر با آرزو رہ کر اُس سے ایک دن کا دکھ بھی نہ جھیلا گیا۔

سُہا نے راگوں کے الاپ سے مکان گونج رہا تھا کہ کیا ایک سدا کی خبر یہاں بھی پہنچی۔ اور راجہ دھرم سنگھ یہ کہتے ہوئے سنائی دیئے ”آپ لوگ بالاجی کو رخصت کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ وہ اسی وقت سدا جا رہے ہیں“

یہ سنتے ہی اُدھی رات کی سی خاموشی بھاگتی سُہا مانگہا اُٹھی اور دروازہ کی طرف لپکی۔ گویا وہ بالاجی کو روک لیگی۔ اُسکے ساتھ سب کی سب عورتیں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور اُسکے پیچھے پیچھے طلپیں۔ برج رانی نے کہا اچھی! کیا اُنھیں زبردستی رخصت کرو گی۔ ابھی تو وہ اپنے کمر پہی میں ہیں سُہا مانا ”میں اُنھیں نہ جانے دوں گی۔ رخصت کرنا کیسا ہا“

برج رانی ”اُٹھا سدا جانا ضروری ہے“

سُہا مانا ”میں کیا سدا کو لیکر جاؤں گی بھانڈ میں جاے۔ آخر میں بھی تو کوئی ہوں میرا ابھی تو اُنپر کوئی حق ہے“

برج رانی ”تھیں میسرے قسم اس وقت اس قسم کی باتیں نہ کرنا۔ ہزاروں آدمی محض اُنکے بھروسے پر جی رہے ہیں۔ نہ جائینگے تو قہر ہو جائیگا“

محبت ماورائے انسانیت اور قومیت کے احساس پر غالب آگئی۔ مگر برج رانی نے سمجھا کر روک لیا۔ سُہا مانا واقعہ کو یاد کر کے ہمیشہ افسوس کرتی تھی۔ اُسے تعجب ہوتا تھا کہ میں آپ سے باہر کیوں ہو گئی تھی۔ رانی صاحبہ نے پوچھا ”برجن! بالاجی کو جیال کون پہنائیگا“

برجن ”آپ“

رانی صاحبہ ”اور تم کیا کرو گی“

برجن ”میں اُنکے ماتھے پر تیک لگاؤں گی“

رانی صاحبہؔ مادھوی کہاں ہیںؔ

برجن۔ (آہستہ سے) اُسے نہ بھڑو۔ یہ چاری اپنے خیال میں مگن ہے۔

اسی اثنا میں بالاجی باہر نکلے۔ اُنھیں دیکھتے ہی لوگوں نے پُرجوش نعرہ مارا بھڑا

کی جے۔ حوریں بھی اُنکی طرف بڑھیں بالاجی نے سُبّا کو دیکھا تو زدیگ اُکرا سکے قدم چوم لئے

سُبّا مانے اُنھیں اُٹھا کر چھاتی سے لگایا۔ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر وفور جذبات نے زبان

ٹھکھنے دی۔ رانی صاحبہ پھولوں کا جیال لیکر چلیں کر اُنکے گلے میں ڈال دوں۔ مگر پیر پتھر اُسے

اور اُسکے دُڑھ سکیں۔ برجن رانی چندن کا تھال لیکر چلی۔ مگر اُنکھیں ندی کی طرح

اُٹا آئیں۔ اور دل بیٹھ گیا۔ تب مادھوی چلی۔ اُسکے آنکھوں میں پریم کی چمک تھی اور چہرہ

پریم کی سُرخی۔ ہونٹوں پر دلاویز مسکراہٹ۔ جھلک رہی تھی۔ اور دل پریم کے نشہ میں

مگن تھا۔ اُسنے بالاجی کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا تو افتخار محبت سے لبریز ہتھیر

اور تب سر نہ بچا کر کے پھولوں کا جیال اُنکے گلے میں ڈال دیا۔ ماتھے پر چندن کا ٹیکہ لگایا۔

اور پریم کا پٹا ہاتھ میں دیدیا۔ مراسم ظاہری کی کسر تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔ اُسوقت بالاجی

نے گہری سانس لی۔ اور اُنھیں معلوم ہوا کہ میں پریم کے اپار سمندر میں بہا جا رہا ہوں۔

ضبط کا لنگڑا کھڑ گیا۔ اور اُس شخص کی طرح جو یکایک پانی میں پھیل چڑا ہو۔ اُنھوں نے بے غما

مادھوی کی بانہ نہ کپڑی۔ مگر آہ! جس تیکے کا اُنھوں نے سہارا لیا وہ خود پریم کی دھار میں تیر

سے بہا جا رہا تھا۔ اُنکا ہاتھ پڑتے ہی مادھوی کے رگ رگ میں بجلی سی کو ند گئی۔ بدن میں لہجہ

آگیا۔ اور جسطرح ہوا کے جھونکے سے پنکھڑیوں پر بجے ہوئے شبنم کے قطرے زمیں پر گر پڑتے

ہیں اُنسی طرح مادھوی کے آنکھوں سے آنسو کی بوندیں بالاجی کے ہاتھ پر ٹپک پڑیں۔ یہ

پریم کے موتی تھے جو ان متوالی آنکھوں نے بالاجی کے بھینٹ لئے ہیں۔ آج سے یہ آنکھیں بچ

دینگلی۔

آسمان پر تارے چمکے ہوئے تھے۔ اور انکی آڑ میں بیٹھی ہوئی دیویاں یہ نظارہ
 دے رہی تھیں۔ آج صبح بالاجی کے خیر مقدم میں یہ نغمہ گایا گیا تھا۔
 بالاجی تیرا آنا مبارک ہوئے

اور اس وقت عورتیں اپنے دلکش اور من بھانے سروں میں گاد رہی ہیں۔
 بالاجی تیرا جانا مبارک ہوئے

آنا بھی مبارک تھا۔ اور جانا بھی مبارک ہے۔ آنے کے وقت بھی آنکھوں سے
 ونکلتے تھے۔ اور جانے کے وقت بھی نکل رہے ہیں۔ کل وہ مہمان کا خیر مقدم کرنے
 آئے تھے۔ آج اُسکا الوداع کر رہے ہیں۔ اُنکا رنگ روپ بالکل یکساں ہے۔
 میں کتنا فرق ہے!

اکتیسویں فصل

متوالی جوگن

مادھوی پہلے ہی سے مہجانی ہوئی کلی تھی۔ حسرت نے اُسے خاک میں ملا دیا۔
 سال کی تیسویں۔ جوگن گئی۔ اُس غریب کی بھی کیا زندگی تھی۔ کہ یا تو دل میں کوئی آرزو
 نہیں ہوئی یا ہوئی تو قسمت نے اُسے پھولنے پھلنے نہ دیا۔ اُسکا پریم عشق کا دریا سب بے کنا
 اُس میں ایسا سیلاب آیا کہ زندگی کی آرزو نہ رہا۔ حسرت نے فنا ہو گئیں۔ اُسے جوگنوں کے

بستر پہن لئے۔ اور علایق دنیا سے آزاد ہو گئی۔ دنیا انھیں اربانوں اور آرزو کا دور

نام ہے۔ جسے انھیں گور حسرت میں دفن کر دیا اُسے دنیا میں سمجھنا بھول ہے۔

اس پریم کے نشہ سے متوالی جوگن کو ایک جگہ قیام نہ تھا۔ بوسے گل کی طرز
دیس دیس پڑتی اور پریم کے شہد سُناتی پھرتی تھی۔ اُسکے زرد چہرہ پر گیر دسے رنگ کی
کفن بہت سُناتی معلوم ہوتی تھی۔ یہ پریم کی مورت دیکھ کر لوگوں کی آنکھوں سے آنسو
نکل پڑتے۔ جب وہ اپنی بین پر کوئی بھجن گانے لگتی تو سنسنے والوں کے دل پریم اور
انوراک سے سرشار ہو جاتے تھے اسکا ایک ایک شہ پریم رس میں ڈوبا ہوتا تھا۔

متوالی جوگن کو بالاجی کے نام سے عشق تھا۔ وہ اپنے پدوں میں اکثر انھیں کی
کیرت سُناتی تھی۔ جس دن سے اُسے جو گیا نہیں لیا۔ اور لوگ لالچ کو پریم پر چنچا و اکا دیا
اُسی دن سے اُسکی زبان پر گویا سر ہوتی بیٹھ گئیں۔ اُسکے رسیلے پد سننے کو لوگ سیکڑوں کو س
چلے آتے تھے۔ جس طرح مٹی کی صدا سنتے ہی گویاں گھروں سے بیقرار ہو کر نکل پڑتی تھیں
اُسی طرح اس جوگن کی تان سنتے ہی انسانوں کا ایک دریا اٹھ پڑتا۔ اُسکے پد سُننا آئند کے
پیالے پینا تھا۔

اس جوگن کو کسی نے ہنستے یا روتے نہیں دیکھا اُسے نہ کسی بات کا رنج تھا۔ نہ کسی
کی خوشی۔ جس دل میں آرزو تھیں نہ ہوں وہ کیوں ہنسنے۔ اور کیوں روئے۔ اُسکا چہرہ
آئند کی تصویر تھا اُس پر نگاہ پڑتے ہو دیکھنے والوں کا آنکھیں، یا کہ سرور سے لہر نہ جاتی تھی

